آپ مرتبہ جناب عرفان عباسی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۹۶، مجلد قیمت ۱۰ روپئے، پتہ (۱) اردو پبلشرز نظیر آباد لکھنؤ، (۲) اردو سماج ڈاکٹر موتی لال بوس روڈ، لکھنؤ،

یہ لکھنؤ کے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۷۵ء تک وفات پانے والے بچاس شعرا کا مختصر سوانحی خاکہ ہے، ان شاعروں میں اکثر کا وطن لکھنؤ تھا، مگر کئی ایسے بھی ہیں، جو اس کے قرب وجوار یا دوسرے مقامات کے رہنے والے تھے، مگر انھوں نے یا تو لکھنؤ ہی میں بود و باش اختیار کرلی تھی، یا عمر کا زیادہ حصہ وہیں بسر کیا تھا، اور لکھنؤ کے شعری ماحول اور ادبی فضا میں ان کی نشو و نما ہوئی تھی، مولانا حسرت موہانی، اور ترقی پسندوں میں احتشام حسین، سجاد ظہیر، مجاز اور بعض دوسرے شاعروں سے قطع نظر سب ہی شعرائے لکھنؤ کے خاص رنگ سخن کے نمائندہ تھے، اس فہرست میں مسعود حسن رضوی ادیب، مرزا محمد عسکری، مولانا عبد الماجد ناظر، نیاز فتحپوری، شوکت تھانوی، اور فرقت کاکوروی وغیرہ کے نام بھی ہیں، جن کی شہرت نثر نگار کی حیثیت سے زیادہ ہے، مگر وہ شاعر بھی تھے، مصنف کو سبھی سے ملنے قریب سے دیکھنے اور ان کا کلام سننے کا موقع ملا تھا، اس لیے انھوں نے ان کا سراپا اس طرح بیان کیا ہے کہ انکی وضع قطع شکل وصورت، سیرت و اخلاق اہم واقعات وحالات اور شعری وادبی خصوصیات بڑی حد تک سامنے آگئی ہیں، کلام کا نمونہ اور تصویریں بھی دی گئی ہیں، شعراء کا یہ تعارفی سلسلہ قومی آواز لکھنؤ کے سنڈے اڈیشن کے لئے لکھا گیا تھا، اب اس کی کتابی صورت میں اشاعت ایک مفید ادبی خدمت ہے، اس سے ان شعراء پر آئندہ کام کرنے والوں کو مدد ملے گی زبان وبیان دلکش ہے، مگر بعض لفظوں کا املا غلط ہے، جیسے السلام علیکم کا اسلام و علیکم سبقت کا صبغت تشبیہ کا تشبیح، اور نسب کا نصب وغیرہ،

جلد ۱۲۴ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۹ء عدد ۲

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

دار المصنفین کی ادبی خدمات

مرتبہ ڈاکٹر خورشید نعمانی - قیمت :- ۲۰ روپیے.

شذرات

دہلی کی مرکزی حکومت کے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کی جگہ پر چرن سنگھ نے وزارتِ عظمیٰ کی باگ سنبھالی تو پورا ہندوستان چیخ اٹھا کہ یہ کیا ہوا؟ اندرا گاندھی کی حکومت سے انتہائی آزردہ ہو کر جنتا نے جنتا پارٹی کو اپنی امیدوں اور امنگوں کا مرجع بنایا تھا مگر پارٹی کے اربابِ حل وعقد کے ذاتی مفاد اور باہمی رقابت سے ان سب پر پانی پھر گیا،

اس کے بعد نجی مجلسوں میں یہ بحث جاری ہے کہ اس ملک میں جمہوریت کامیاب ہو سکتی بھی ہے کہ نہیں، بادشاہت کا نعم البدل جمہوریت ہے مگر اس کی تاریخ بادشاہت ہی کی طرح داغدار رہی، عہدِ قدیم میں ایتھنس میں تیس سال کی عمر کے شہریوں کے ایک کانسل کے ذریعہ سے شہری ریاست قائم ہوئی، تو یہ ناکام ہو گئی، سقراط اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ کانسل کا ہر رکن ہر عہدہ کے لئے موزوں ہو، اس کے خیال میں اچھے اخلاق کا اچھا انسان ہی اچھا شہری بن کر حکومت کا اچھا عہدیدار ہو سکتا ہے، اس کے شاگرد افلاطون نے اچھے اخلاق کے شہریوں کی ایک جمہوری ریاست بنانے کی کوشش کی، وہ اپنے زمانہ کے سیاست دانوں پر یہ کہکر حملہ آور ہوا کہ وہ زیادہ تر مسائل سے ناواقف ہوتے ہیں، ان کی ناواقفیت جمہوریت کے لئے لعنت ہوا کرتی ہے، وہ خود غرض بھی ہوتے ہیں، ان کے ذہن پر ذاتی اغراض ہی کی بنا پر اپنے طبقہ کا مفاد حاوی رہتا ہے، وہ معاشی ناہمواری کو دور کرنے میں ناکامیاب رہتے ہیں تو امیروں اور غریبوں کا جھگڑا قصداً کھڑا کر دیتے ہیں، افلاطون اپنے عام شہریوں سے بددل ہو کر حکومت کی باگ ڈور ایسے آدمیوں کے ہاتھ میں دینے کا خواہاں ہوا جو فلسفی بھی ہوں،

وہ فلسفیوں کی جمہوریت بنانے میں ناکام رہا تو اس کے شاگرد ارسطو نے اپنی کتاب "پالٹکس" میں بادشاہت اور امارت (اریسٹوکریسی) کے علاوہ جمہوریت پر بحث کرتے ہوئے اس کی کئی قسمیں بتائیں، عوامی جمہوریت (اکسٹریم ڈیموکریسی) کسانوں کی جمہوریت، معتدل قسم کی جمہوریت (موڈریٹ ڈیموکریسی)، اور چند لوگوں کی

جمہوریت نما حکومت (اولی گارکی)، اس کے نزدیک عوامی جمہوریت پسندیدہ نہیں ہوئی، کیونکہ اس میں زیادہ تر شہر کے رہنے والوں کا قبضہ ہو جاتا ہے جو صاحبِ اقتدار ہونے کے بعد ڈیماگوگس ہو جاتے ہیں، وہ قانون کا زیادہ احترام نہیں کرتے، ان کی جمہوریت ظلم کی طرف مائل ہو جاتی ہے، ان کو اپنے عوام کے سفلی جذبات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے جس کے بعد حکومت کے نظم ونسق کا اچھا ہونا ضروری نہیں،

ارسطو کی رائے ہے کہ جب کسانوں کی جمہوریت قائم ہوتی ہے تو ان کو اپنے مسائل کے علاوہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی ہے، ایسی جمہوریت پر اوپر کے طبقہ کے لوگ چھا جاتے ہیں، جو کسانوں کے مسائل کے حل کرنے کے بعد اپنے ذاتی مسائل کی تکمیل میں لگے رہتے ہیں، اس سے چند لوگوں کی حکومت یعنی اولی گارکی پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے اگر اولی گارکی قائم ہو جاتی ہے تو اس پر قابو پانا جمہوریت سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، ارسطو کے نزدیک موڈریٹ ڈیموکریسی نسبتاً زیادہ بہتر ہے، اس کو وہ مڈل کلاس کی جمہوریت بھی کہتا ہے، اس کے خیال میں یہ اس وقت کامیاب ہوتی ہے جب اس کو چلانے کے لئے تجربہ کار افراد حاصل ہو جائیں، اس کی یہ بھی رائے تھی کہ موڈریٹ ڈیموکریسی کے ساتھ اولی گارکی بھی ہو، تو ایک پائدار حکومت قائم ہو جاتی ہے،

جمہوریت کے بہت سے تجربات ہو چکے ہیں، اس میں بھی بادشاہت ہی کی طرح راج ہٹ ہوتی رہی ہے، جس سے جمہور کم و بیش ہر جگہ غیر مطمئن اور بے چین رہے، ان کی آزادی کے لئے خدا جانے کتنے سیاسی فلسفی پیدا ہوئے، روسو، ہابس، ایڈم اسمتھ، لاک، گرین اور جان اسٹورٹ مل وغیرہ سب ہی نے جمہور کی آزادی کا راگ الاپا ہے، مگر جمہور کا استحصال اسی طرح جاری ہے جس طرح کہ بادشاہت کے زمانہ میں تھا، جمہوریت کے نمائندے جب اربابِ حکومت بن جاتے ہیں تو ان سیاسی فلسفیوں کے زریں اصولوں کو سامنے رکھنے کے بجائے اٹلی کے ایک شاطر سیاست داں میکاولی کو اپنا رہبر بنا لیتے ہیں جس کی سیاست کا لب لباب یہ ہے کہ سیاست میں بداخلاقی کوئی چیز نہیں ہے، سیاسی مقصد کے حصول اور اقتدار قائم رکھنے کی خاطر اصحابِ حکومت بداخلاق ہو کر طاقت اور فریب بھی استعمال کر سکتے ہیں، اس کا خیال تھا کہ جمہور عموماً برے ہوتے ہیں، برے آدمیوں کے

بُرائی بن کر حکومت کی جاسکتی ہے، جمہور کی امیدوں کی کوئی حد نہیں ہوتی ہے جس سے معاشرہ بگڑتا رہتا ہے، اس کو درست کرنے کے لئے جمہوریت کی پُرفریب مطلق العنانیت کی ضرورت ہوتی ہے،

———*———

میکاولی ہی کے ایک ہم نوا سیاسی فلسفی کا خیال ہے، کہ سیاست میں سلامت روی گدھے سیاست داں اختیار کیا کرتے ہیں، اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جمہوریت میں سب سے زیادہ احمق سب سے زیادہ عاقل، اور سب سے زیادہ عاقل سب سے زیادہ احمق بن جاتا ہے،

———*———

ہمارے ملک نے اپنے سیاسی نظام کے تمام اصولوں کو یورپ ہی سے درآمد کیا ہے، یہ ان تمام منزلوں سے گذر رہا ہے، یہاں کے شہری ابھی تو دم سادھے اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ یہ جمہوریت اُن کو کہاں لے جاکر چھوڑتی ہے، سردست وہ اپنے اپنے حلقہ کے نمایندہ سے زبان حال سے کہہ رہے ہیں،

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

———*———

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ نظر و فکر نکلنا شروع ہوا ہے، اس کے مدیر جناب اسلوب احمد انصاری صدر شعبۂ انگریزی ہیں، انگریزی کے فاضل اور لائق استاد ہونے کی حیثیت سے وہ انگریزی زبان میں بہت کچھ لکھ کر اپنی قابلیت اور استعداد کا ثبوت دے سکتے تھے، مگر اردو زبان کی محبت میں اردو ہی میں برابر مضامین اور کتابیں لکھ کر اس کے ادبی نقادوں میں نمایاں و امتیازی جگہ حاصل کرلی ہے، ابھی تو اس کا ایک ہی شمارہ نکلا ہے لیکن امید ہے کہ اُن کے ادبی ذوق کی لطافت اور سلامت روی سے ان کی نگرانی میں آیندہ جو شمارے نکلیں گے اُن میں زبان کی ہمواری اور خوبی کے ساتھ تنقید نگاری کا اعلیٰ معیار اس طرح قائم رہیگا کہ اس سے اردو کی علمی و ادبی دولت میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا، مسلم یونیورسٹی کی یہ روایت رہی ہے کہ جب کچھ اچھے مضامین جمع ہو جاتے ہیں تو ایک مجلہ شان سے نکل آتا ہے، اور پھر سٹاّ ٹا چھا جاتا ہے، خدا کرے اسلوب احمد انصاری صاحب اپنی نگرانی میں اس روایت کے خلاف اپنی شاندار روایت قائم کریں؛

———*———

استاذی المکرم جناب مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور تصنیف "خیام" کا نیا اڈیشن چھپ کر تیار ہے، شائقین اس کو طلب کر سکتے ہیں،

مقالات

مطالعہ ملفوظاتِ خواجگانِ چشت کے مبادیات

(خواجگان چشت کے ملفوظات کی روشنی میں)

از مولانا اخلاق حسین دہلوی بستی نظام الدین دہلی

عہد حاضر میں ہند و پاک میں کتب ملفوظات پر تنقیدیں لکھی جارہی ہیں، اہل علم تو نہیں، البتہ ناواقف ان کے مطالعہ سے گمراہ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا کتب ملفوظات پر کچھ لکھنے سے پہلے ان امور سے روشناس کرانا مناسب ہوگا جو ان کے خیالات کی اساس اور غلط فہمیوں کے اسباب ہیں، انھیں ذہن نشین رکھنے سے کتب ملفوظات کا مطالعہ نفع بخش ہوگا، (انشاءاللہ تعالیٰ) ان میں سے اہم ترین یہ ہے کہ کتب ملفوظات آج تک نقد و تصحیح کے ساتھ شائع نہیں ہوئی ہیں،

ملفوظات کیا ہیں؟ ملفوظات مجموعہ ہوتے ہیں، اُن بیانات کا جو اخلاق فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کی ترغیب و تحریص کے لیے صوفی بزرگ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے مجمع میں بیان کیا کرتے ہیں اور کرتے تھے، ان میں سامعین کی استعداد کا، ان کے امراضِ قلبیہ کے دفعیہ کا اور ان کی روحانی ترقی کا پورا پورا لحاظ ہوتا ہے، اکابر اولیاءاللہ کا ذکر بھی آجاتا ہے، جو اثر و تاثیر کو دوبالا کر دیتا ہے۔ ملفوظات کو اشارات و ارشادات اور اقوال و فوائد

بھی کہتے ہیں، اور ان کے مجموعوں کو کتب اہل سلوک اور کتبِ مشائخ سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ملفوظات کی اہمیت

ملفوظات کو زمانۂ قدیم سے اہمیت و مقبولیت حاصل ہے۔ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور انھیں اصلاحِ حال کے لیے نفع بخش مانا جاتا ہے۔ ان کا شمار کتب اہل سلوک اور کتبِ مشائخ میں ہوتا ہے، حضرت بابا صاحبؒ کا ارشاد ہے۔

اگر کسے را شخصے کامل نباشد کتاب اہل سلوک پیش خود دارد و متابعت آں نماید (راحت القلوب ص ۱۵)

اگر کسی کو شیخ کامل نہ ملے تو وہ اہل سلوک کی کتاب کا مطالعہ کرے، اور اس کی پیروی کرتا رہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے بارہا خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ کو نصیحت فرمائی ہے۔

کتابِ مشائخ و اشاراتِ ایشاں کہ در سلوک راندہ اند در نظر می باید داشت (فوائد الفواد ص ۳۰)

مشائخ کی کتاب اور ان کے اشارات جو انھوں نے سلوک کے باب میں فرمائے ہیں مطالعہ میں رکھنے چاہئیں۔

ان ارشادات سے مشائخ کرام کی کتابوں کا وجود، ان کا منفعت بخش ہونا اور انکی قدر و منزلت واضح ہے، اس اجمال کی تفصیل کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے

چوں بخدمت شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہٗ العزیز پیوستم ہمیں معنیٰ در خاطر کردم کہ ہرچہ از لفظ مبارک ایشاں خواہم شنید خواہم نوشت . . . . ہرچہ از شیخ شنودہ شد نوشتم چوں بمقام خود باز آمدم نسخہ کردم۔ بعد ازاں ہرچہ سماع می افتاد در قلم می آوردم تا ایں معنیٰ بخدمت شیخ باز نمودم۔ بعد ازاں ہرگاہ کہ حکایتے و اشارتے بیان کردے می فرمودے حاضر ہستی تا ایں غایت کہ اگر من غائب بودے چوں بخدمت باز پیوستمے فائدہ کہ در غیبت فرمودے آں را اعادہ کردے۔ (فوائد الفواد ص ۳۰)

جب میں حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت فیض درجت سے وابستہ ہوا تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جو کچھ میں آپ کی زبان مبارک سے سنوں گا لکھ لیا کرونگا . . . . لہٰذا جو کچھ میں حضرت بابا صاحبؒ سے سنتا وہ لکھ لیا کرتا۔ جب اپنی قیام گاہ پر واپس آتا تو کتاب میں لکھ لیتا اس کے بعد جو کچھ سنتا اسے لکھ لیتا حتی کہ یہ بات میں نے حضرت بابا صاحبؒ کو بتادی اسکے بعد حضرت بابا صاحبؒ کوئی حکایت یا کوئی اشارہ و نکتہ بیان فرماتے تو مجھ سے فرماتے حاضر ہو یہاں تک عنایت تھی کہ اگر میں موجود نہ ہوتا اور دیر سے حاضر خدمت ہوتا، تو جو کچھ بیان فرما چکے ہوتے اسے دوبارہ بیان فرماتے تھے۔

(۱) ایسا لگتا ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت بابا صاحبؒ کے بیان فرماتے وقت ہی لکھ لیا کرتے تھے، یا بعض ارشادات کی مدد سے بعد میں تفصیل سے لکھ لیتے تھے، راحت القلوب کی عبارت دیگر ملفوظات سے مختلف ہے مگر دیرینہ روزی کے اثرات کے باوجود سلیس و رواں اور موثر ہے۔

(۲) حضرت بابا صاحبؒ کی خانقاہ میں مریدوں کے قیام کے لیے علٰحدہ جگہ تھی، جہاں حضرت محبوب الٰہیؒ کے لیے پلنگ بچھوایا گیا تھا، اور جہاں دیگر مرید بھی مقیم تھے جن میں حافظ قرآن بھی تھے۔ (سیر الاولیاء ص ۱۰۰)

(۳) حضرت بابا صاحبؒ کی قیام گاہ علٰحدہ تھی، جہاں ایک بار حضرت محبوب الٰہیؒ نے آپ کے پلنگ اور بستر کی زیارت کی تھی، اور آپ کو عالم وجد میں دیکھا تھا۔ (فوائد الفواد ص ۵۱-۵۲۔ سیر الاولیاء ص ۱۲۳)

(۴) ملفوظ میں لفظ نسخہ کردم یہ بتاتا ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت بابا صاحبؒ کے ارشادات کو کمال حزم و احتیاط سے اور اخلاص و احترام کے ساتھ بشکل کتاب مدون فرماتے تھے، وہ یادداشت سی مگر تھی بصورت کتاب۔ جو نصف صدی کے

قریب تک آپ کے پاس محفوظ تھی۔

(۵) یہ اہتمام کہ اگر کبھی حضرت بابا صاحبؒ کچھ فرمانا شروع کر دیتے اور حضرت محبوب الٰہیؒ موجود نہ ہوتے تو آپ کے پہنچتے ہی اعادہ فرماتے اور بیان کو دہراتے تھے اس کو بھی ملفوظات کی افادیت ظاہر ہے۔

(۶) اس سے بھی ملفوظات کی اہمیت واضح ہوتی ہے، کہ اگر حضرت بابا صاحبؒ مزید توجہ کی ضرورت سمجھتے تو دورانِ بیان میں متنبہ کرتے اور فرماتے حاضر ہستی توجہ سے سن رہے ہو نا۔

(۷) "سماع می افتاد" اور "در قلم می آورد" ماضی استمراری کے افعال ہیں جو سننے اور لکھنے کے باہمی تواتر کو ظاہر کرتے اور بتاتے ہیں کہ اس کا تعلق قیام اجودھن سے ہے، حضرت بابا صاحبؒ کی مجلس میں جو کچھ سنا، قیام گاہ پر آکر اسے مرتب کر لیا، شوق اور لگن کا اقتضا بھی یہی تھا۔

(۸) یہ بھی یقینی ہے کہ تالیف ملفوظات کی روایت بزرگانِ سلف سے تعلق رکھتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت بابا صاحبؒ اس قدر اہتمام نہ فرماتے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ ہرگز اپنے مریدوں کو ملفوظات کی تدوین کی اجازت نہ دیتے۔ اور آپ کے بزرگ خلفا جن میں شیخ برہان الدین غریبؒ[1] اور مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے نام نامی سرفہرست ہیں[2] ہرگز اس پر عمل پیرا نہ ہوتے۔

(۹) حضرت بابا صاحبؒ کے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے معمول سے اس کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ خواجہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین

---

[1] نفائس الانفاس [2] خیر المجالس ؟

بختیار اوشیؒ سے جو کتب ملفوظات منسوب ہیں وہ دیرینہ اثرات کے باوجود بالیقین ان ہی کے رشحاتِ قلم کا ثمرہ ہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

کراماتے معائنہ کردم۔ ہمدران	میں نے ایک کرامت دیکھی، ان ہی دنوں میں
ایام مردے مرا کاغذہا سفید داد یک جا	ایک شخص نے مجھے سفید کاغذ دیے جو یکجا جلد بستہ
جلد کردہ۔[1] من آن را بستدم	تھے، میں نے لے لیے اور ان پر شیخ کے ملفوظات
فوائد شیخ ہم دران ثبت کردم،	کو لکھا۔

(فوائد الفواد ص ۳۰)

لفظ کراماتے بتاتا ہے، کہ سفید کاغذوں کا ملنا۔ ملفوظات کی اہمیت کے پیش نظر تھا جو حضرت بابا صاحبؒ کی توجہ ہی کا ثمرہ تھا، اسی لیے اسے کراماتے سے تعبیر کیا ہے، اس گفتگو کے دوران حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ا۔

تا ایں غایت آں مجموعہ بر من است	اب تک وہ مجموعہ ملفوظات میرے پاس ہے

حضرت محبوب الٰہیؒ نے ۲۰ شوال ۷۰۹ھ کی مجلس میں یہ ذکر کیا تھا۔ گویا کہ چالیس برس کا طویل زمانہ گزر چکا تھا، مگر آپ نے اسے کلیجے سے لگا رکھا تھا، اس سے زیادہ، ملفوظات کی اہمیت اور کیا ہوگی۔ (ص ۳۱)

اس مجموعہ کے رواج میں آنے کی اطلاع ہمیں شمائل الانقیا[2] و دلائل الاتقیا سے

---

[1] پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اس جملے کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ایک شخص نے سفید کاغذ جلد بندھا ہوا مجھے دیا (حضرت نظام الدین اولیاء۔ حیات و تعلیمات ص ۸۶) یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے، عبارت میں کاغذہا ہے جو واحد نہیں جمع ہے، اس امتیاز کو نظر انداز کرنے سے ترجمہ خلاف محاورہ بھی ہو گیا، تاہم اس سے یہ واضح ہے کہ مرحوم کو اردو و فارسی اسالیب سے کتنی آگاہی تھی۔ [2] ایک فاضل نقاد نے نام شمال الاتقیا و دلائل اشقیا لکھا ہے، (منادی دہلی جلد ۵۲ شمارہ ۷ تا ۸ ۱۹۷۷ء) جو غلط ہے اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے جو فارسی مخطوطات کی کیٹلاگ مطبوعہ ۱۹۲۶ء ص ۱۱۵ میں ۱۱۹۰ نمبر پر ہے اور ۱۱۱۱ء کا

ملتی ہے، جس کو حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلیفہ شیخ برہان الدین غریبؒ (المتوفی ۷۳۲ھ) کے ایما سے ان کے فاضل ترین مرید مولانا رکن الدین کاشانیؒ نے تصنیف کیا تھا، اس میں متعدد کتب ملفوظات کی فہرست ہے، جس میں یہی مجموعۂ ملفوظات راحت القلوب کے نام سے موجود ہے، جو اس کے مستند و معتبر اور مقبول و مروج ہونے کی بین دلیل ہے، اس مجموعۂ ملفوظات کی متعدد روایتیں کتاب مفاتح الجنان[1] میں بھی ہیں جو مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مرید معتبر عالم محمد مجیر وجیہ ادیبؒ کی تصنیف ہے اور جو ۷۵۶ھ کی یادگار ہے۔

ایسے بیانات اور بھی ہیں، جن سے ملفوظاتِ مشائخ کی اہمیت و افادیت واضح ہے، حضرت باباصاحبؒ کے ایسے ہی ایک بیان کا اعادہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا ہے، جو افضل الفوائد (ص ۱۱۱ - ۱۱۲) کی زینت ہے، الغرض اخلاق و سلوک میں ملفوظات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اگر انھیں صحت کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا جائے تو وہ آج بھی ہمارے دکھ کی دوا ہیں، اور آیندہ بھی۔

۳۔ ملفوظ و ملفوظات ملفوظ اور اس کی جمع ملفوظات کا معنی معروف میں استعمال زمانۂ قدیم سے ملتا ہے، خیر المجالس تالیف ۷۵۵ھ میں اور مفاتح الجنان تالیف ۷۵۶ھ میں بھی متعدد جگہ ذکر ہے، سیر الاولیا اولین و قدیم ترین تذکرہ ہے، اس میں بھی ملفوظ و ملفوظات کا استعمال جابجا ملتا ہے، مثلاً

خیر المجالس

(۱) ملفوظ مولانا برہان الدین غریبؒ (صفحہ ۱۰)

---

[1] مفاتح الجنان کا ایک قدیم قلمی نسخہ راقم کے پاس ہے، ایک نسخہ مفتاح الجنان نام سے ذخیرۂ مخطوطات ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے جو کیٹلاگ مطبوعہ ۱۹۲۶ء کے ص ۴۰۹ پر ہے۔

(۲) در ملفوظ خواجہ عثمان ہارونیؒ مشکلے شدہ است (صفحہ ۵۲)

(۳) ملفوظاتِ شیخ قطب الدین و شیخ عثمان ہرونیؒ (صفحہ ۵۳)

مفاتح الجنان

(۱) از ملفوظ شیخ المشائخ والاولیا فرید الدین قدس سرہ العزیز (ورق ۳۴)

(۲) از ملفوظ شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز (ورق ۱۱۶)

(۳) از ملفوظ شیخ الاسلام شیخ فرید الدین " (ورق ۲۳۰ ب)

سیر الاولیاء

(۱) در بعضے ملفوظاتِ شیخ شیوخ العالم فرید الحق ..... قدس سرہٗ العزیز سلطان المشائخ قدس اللہ سرہٗ العزیز بخطِ مبارکِ خود در قلم آوردہ (ص ۴)

(۲) بزرگے از ملفوظات شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز پانصد کلمہ جمع کردہ است۔ (ص ۶)

(۳) خواجہ شمس الدین دھاریؒ ..... از ملفوظاتِ سلطان المشائخ کتابے نوشت۔ (ص ۱۱۸)

(۴) از ملفوظات جان بخشِ سلطان المشائخ کتابے نبشتہ است و انوار المجالس نام کردہ است۔ (ص ۲۰۰)

(۵) در آخر عمر فوائد الفواد کہ ملفوظاتِ سلطان المشائخ است بخط مبارک خود نوشت۔ (ص ۲۰۸)

(۶) از ملفوظاتِ روح افزاے سلطان المشائخ فوائد چند نبشت ..... امروز آں فوائد الفواد مقبول اہل دلانِ عالم شدہ است۔ (ص ۳۰۸)

(۷) امیر خسروؒ کرات گفتے . . . . . کاشکے تمامی کتب کہ عمر دراں صرف کردہ ام برادرم امیر حسن، ابودے و ملفوظات سلطان المشائخ کہ جمع کردۂ او ست مرا بودے (ص ۳۰۸)

(۸) در ملفوظاتِ حضرت شیخ الاسلام معین الدین سجزی بنشتہ دیدہ ام۔ (ص ۴۶۶)

(۹) در ملفوظات شیخ الاسلام معین الدین سجزی بنشتہ دیدہ ام (ص ۴۹۱)

لفظ ملفوظ و ملفوظات معنی معروف میں زمانۂ قدیم سے مروج ہیں، ان کے علاوہ دیگر کتب قدیمہ میں بھی ملتے ہیں، انھیں اختراع جدید تصور کرنا صحیح نہیں ہے، بہر حال ان اقوال و شواہد سے ان الفاظ کا رواج اور ان کی قدامت بخوبی واضح ہے۔

۴۔ **کتب ملفوظات کی تدوین** سعادت مند مرید اور معتقد جن میں نوشت و خواند کا ذوق ہوتا تھا، وہ ان بیانات کو قلم بند کر لیا کرتے تھے، جو اپنے شیخ بزرگ سے سنتے تھے، تاکہ انھیں پیش نظر رکھیں، ان کے مطالعہ سے مستفید ہوتے رہیں، اور فیوض و برکات حاصل کرتے رہیں۔ بعض دوران بیان ہی میں لکھتے جاتے تھے، اور بعض یادداشت کی مدد سے مرتب کر لیا کرتے تھے، حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان سے مترشح ہے کہ آپ دوران بیان ہی میں قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ اور فوراً بعد ہی نہایت شوق و اہتمام سے کتاب میں لکھ لیا کرتے تھے، جو ملفوظات کے لیے مخصوص تھی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کو حضرت بابا صاحبؒ سے جو والہانہ شغف اور قلبی لگاؤ تھا، جس کے معترف حضرت بابا صاحبؒ بھی تھے، (فوائد ۱۱۲) اس کا اقتضا یہی تھا، کہ ہاتھوں ہاتھ اس کو انجام دیں۔ وہ کب یہ گوارا کر سکتے تھے کہ التوا میں ڈالے رہیں، اور جب دلی جائیں تو مرتب فرمائیں، یہ بعید از قیاس ہے۔ الغرض کتب ملفوظات کو مرتب کرنے کا دستور قدیم سے ہے، اس کا تعلق ذوق و ارادت سے ہے، نشر و اشاعت سے نہیں۔ صوفیائے کرام مستثنیٰ حالات کے سوا ایسے امور میں

محتاط رہتے تھے، جو نام و نمود کا سبب ہوں، غالباً یہی سبب تھا کہ حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات جو حضرت محبوب الٰہیؒ نے مرتب فرمائے تھے، مدت مدید تک آپ کے پاس محفوظ رہے۔ مگر ان کے رسمی نشر و اشاعت کی طرف آپ متوجہ نہیں ہوئے۔ آج کس سے یہ بات بن پڑتی ہے، اس زمانہ میں ایسا صبر و ضبط عنقا ہے،

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے شیخ محترم کے ملفوظات کو کچھ اس طرح مرتب فرمایا ہے کہ دیرینہ اثرات کے باوجود اس میں حضرت بابا صاحبؒ کی معجز بیانی کی آب و تاب جا بجا جلوہ ریز ہے، جو مطالعہ کرنے والے کے دامن دل کو پکڑ لیتی ہے۔ اسلوب بیان دیگر کتبِ ملفوظات سے مختلف سادہ و سلیس اور جاذب توجہ ہے، یہ اسی اخلاص کا پرتو ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کو حضرت بابا صاحبؒ کی جناب میں تھا، شیخ محترم کا ایسا متوالا کوئی دوسرا نہیں ملتا۔

غرض کہ کسی پہلو سے جائزہ لے لیجیے ملفوظات اور ان کی تدوین کی اہمیت روز روشن کی طرح جگمگاتی نظر آئے گی۔

تدوین ملفوظات کے باب میں یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے، کہ کتب ملفوظات کو مرتب کرنے والے کتنے ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہوں۔ مگر وہ راہ سلوک میں مبتدی ہوتے تھے، وہ خیالات کو ہو بہو گرفت میں لانے کی سعی کرتے ہوں گے مگر کیا ضروری ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوتے ہوں، مشاہدہ شاہد ہے کہ عقر جتنا سحر بیان ہوتا ہے تقریر جس قدر جامع اور دلپذیر ہوتی ہے، اتنا ہی اس کا ہو بہو اور لفظ بلفظ گرفت میں آنا دشوار ہوتا ہے، ذہن و فہم اور علمی استعداد کے علاوہ مشق و مہارت اور کمال انشا پردازی کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، تا وقتیکہ قلم و زبان پر قدرت نہ ہو اس فرض سے عہدہ برآ ہونا

کارے دارد ہے۔ کہتے ہیں وہ مجموعۂ ملفوظات جنھیں قدامت کی سند حاصل ہے، بہت سے ناپید ہوگئے ہیں، کچھ ہیں جو اسمیست کہ مسمیٰ ندارد کی مصداق ہیں۔ البتہ جن میں خلوص اور کمالِ فن کا پرتو ہے، وہ ہیں مگر عقیدت مندوں کی بے اعتنائی سے ہدفِ تنقید بنے ہوئے ہیں ؂ قیاس کن ز خزانِ من بہارِ مرا۔

تقریر و تحریر

تقریر و تحریر کے اسلوب میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، اہلِ علم اس نکتے سے آگاہ ہیں کہ حشو و زوائد اور اعادہ و تکرار تقریر میں نبھ جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات ان سے تقریر میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ادنیٰ سے تصرف سے تقریر دلوں کو موہ لیتی ہے۔ مقرر کا اسلوب اختصاصی شے ہے، جو مجمع کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے، دورانِ تقریر مقرر کی وجدانی کیفیت غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتی، اور مجمع کو مسحور کر لیتی ہے۔ جو احاطۂ تحریر میں سما نہیں سکتی۔ مجمع جب جوش و خروش اور جذبے سے معمور ہوتا ہے، تو خطیب و مقرر کے الفاظ اور حرکات و سکنات اور چشم و ابرو بھی کچھ کہنے لگتے ہیں، اور ایسے جذبات و کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں، جو انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے، وہ پیکرِ اثر و عمل بن جاتے ہیں، لیکن قلم عاجز رہتا ہے، ان کیفیات کو گرفت میں لانے سے وہ تقریرِ اثر کا ثمرہ ہوتی ہیں، الفاظ کے پیکر بے جان ہیں ان کی تلاش سعیِ لاحاصل ہے۔ نظامی گنجوی کے کلام سے اس کی تائید ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

بگفت در من بشنود ہر آنچہ گفتن داشت	کہ در بیان نگنجش کرد بر زبان تقدیم
لبش چو نوبتِ خویش از نگاہ باز گرفت	فتاد در سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

اس نے نہیں کہا مگر جو کچھ اسے کہنا تھا، وہ میں نے سن لیا سمجھ لیا۔ دورانِ تقریر میں اس کی نگاہ نے زبان کھلنے سے پہلے ہی مجھ سے کہہ دیا تھا، جب ہونٹوں نے

نگاہ سے اپنی باری لی اور زبان سے بات نکلی تو ایسا لگتا تھا کہ قوتِ سامعہ بلکہ دل و دماغ کوثر و تسنیم کی لہروں میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

ماہرینِ نفسیات اس پر متفق ہیں کہ تقریر اپنے مناسب ماحول میں جس قدر مؤثر اور دلپذیر ہوتی ہے، اس کے غیر میں نہیں ہوتی، خصوصاً وہ تقریر جس میں سامعین کی کامل توجہ اور مقرر کے اسلوب کی کارفرمائی اور تعدیۂ اثر کو دخل ہوتا ہے، بے پناہ اور ہر گرفت سے بالاتر ہوتی ہے، جس کا راز اس کے اشارات و اجمال میں مضمر ہوتا ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے۔

کَلَامُنَا اِشَارَۃٌ فَاِذَا	ہمارا کلام اشاروں میں ہے جب
صَارَ عِبَارَۃً صَارَ جَفًا۔	وہ عبارت کے روپ میں آتا ہے تو
	خشک ہو جاتا ہے۔

گویا وہ لطافت جو تقریر میں ہوتی ہے، تحریر میں برقرار نہیں رہتی، یہ بہت بلیغ اشارہ ہے۔ اور یہ وہی شخص کہہ سکتا ہے، جو تقریر کی نفسیات سے کما حقہٗ آگاہ ہے، لہٰذا کسی مجموعۂ ملفوظات میں تقریر کے مبینہ مؤثرات کی تلاش بے سود ہے۔ ملفوظات کا وصف یہ ہے کہ صدہا سال گزر جانے کے باوجود اور عقیدت مندوں کی بے اعتنائی کے باوجود طبائع ان سے متاثر اور کیف اندوز ہوتی ہیں۔ مرزا غالب کا یہ کہنا بھی بجا و درست ہے ؂

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ	پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

وہ دل و دماغ جو مبتلائے مادیت ہیں۔ وہ روحانی فضا سے کوسوں دور ہیں انھیں البعد المشرقین ہے۔ ان سے چشمِ امید بے سود ہے، یہ بھی اس باب میں ایک اہم نکتہ ہے،

کہ بعض تقریروں کے بعض جملے ایسے سحر آگیں ہوتے ہیں جو سالہا سال بلکہ صدیوں تک محفوظ رہتے ہیں، اور سننے والوں پر جادو کا سا اثر کرتے ہیں۔ انھیں مستثنیات میں سمجھنا چاہیے، تقاریر جو شائع ہوتی ہیں، جو راز درون پردہ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں، وہ بعینہٖ ہی اسٹیج کی آواز نہیں ہوتیں، بلکہ انھیں حک و اصلاح سے تحریر کے سانچے سے ڈھالا جاتا ہے، البتہ انداز تخاطب کی رعایت ملحوظ رہتی ہے، فوائد الفواد میں بعد ازاں فرمود، نخستے اور آں گاہ فرمود کی پیوند کاری بھی اسی کی مؤید ہے، الغرض، تقریر اور مجامع کی کیفیات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے روح الاجتماع کا مطالعہ سود مند ہے، جو فرانسیسی ماہر نفسیات موسیولیبان کی مشہور تصنیف کراؤڈ کا ترجمہ ہے، اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوتا رہا ہے۔

فوائد الفواد کا کمال

فوائد الفواد حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ نے مرتب فرمایا تھا، اس میں بقول امیر خورد کرمانیؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کے اسلوب کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ "عین تقریر سلطان المشائخ بقدر امکان رعایت کردہ" (ص ۳۰۸) اس میں بقدر امکان قابل لحاظ ہے، کیونکہ مولف نے جابجا بعد ازاں فرمود۔ آں گاہ فرمود اور نخستے کا سہارا لیکر عبارت کو مربوط کیا ہے، اور بقول مولانا ضیاء الدین برنی وہ اسی عہد سے مقبول و مروج ہے، جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں ہم تک محفوظ نہیں پہنچ سکا ہے، کہیں تاریخ دن اور مہینہ ہے، بیان ندارد (ص ۱۶۶) کہیں دن اور تاریخ میں مطابقت نہیں ہے کہیں دن ندارد ہے تو کہیں تاریخ ندارد۔ متن میں بھی خاصا کچھ خلفشار ہے، یہ حال ہے اس مجموعۂ ملفوظات کا جو متداول چلا آتا ہے۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا۔

خواجہ امیر حسن علاء سجزی نامور شاعر و ادیب کہنہ مشق انشا پرداز اور باکمال

اہل قلم تھے، انھوں نے ۲۰ر شوال ۷۰۸ھ کی مجلس میں حضرت محبوب الٰہیؒ سے عرض کیا تھا،

ازسالے زیادہ باشد کہ در بندگی پیوستہ ام۔ ف (۳۰)

اس بیان سے یہ واضح ہے کہ خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ ۷۰۷ھ میں بیعت ہوئے تھے، مولانا حامد جمالی کا بیان ہے کہ بیعت ہونے کے وقت خواجہ امیر حسن علاء سجزی کی عمر ہشتاد برس کی تھی، (سیر العارفین ص ۸۰)[1] گویا کہ خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ پختہ کار اہل قلم تھے، انھوں نے فوائد الفواد کو بڑی خوبی سے مرتب کیا۔ ان کے اخلاص اور خون جگر کی چاشنی لفظ لفظ سے مترشح ہے۔ انھوں نے دیدہ ریزی اور باریک بینی سے کام لیا، خون پسینہ ایک کیا، نوک پلک کو سنوارا۔ اور بیان کو اس خوبی سے مرتب کیا کہ تقریر کا اسلوب بھی برقرار رہا ہے، اور حشو و زوائد اور اعادہ و تکرار کی پرچھائیں بھی پڑنے نہ پائی، جو تقریر کے لوازم میں سے ہے۔

خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ نے غالبًا اس کام کے لیے اپنے کو فارغ بلکہ وقف کر لیا تھا، ان کا یہ شاہکار مونھ سے بول رہا ہے کہ آخری ایام حیات کا ان کے لیے یہی دلچسپ مشغلہ تھا جس میں وہ ہمہ تن مشغول رہتے تھے، اس لیے فوائد الفواد کو مقبولیت بھی نصیب ہوئی، اور حیات جاویدی بھی، غالبًا ان ہی اثرات سے متاثر ہو کر خواجہ سید محمد حسینی گیسو درازؒ کو یہ کہنا پڑا تھا۔

ملفوظ شیخ نظام الدین کہ امیر حسن شاعر جمع کردہ است آں معتبر است و ملفوظ ہائے دیگر از اں شیخ بنشتہ اند ہمہ باد و ہوا است۔	(حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات جو امیر حسن شاعر نے جمع کیے ہیں، وہ معتبر ہیں، اور جو دوسرے ملفوظات آپ کے لکھے ہیں، وہ سب باد ہوا ہیں (سطحی طلب کا ثمرہ ہیں یا خواہش بے جا کا نتیجہ ہے)

[1] معارف۔ یہ بات تحقیق طلب ہے۔

اس ارشاد کا مدعا بظاہر تو یہی ہے، کہ خواجہ امیر حسن علاء سجزی نے جتنے ذوق وشغف اور جانسوزی سے فوائد الفواد کو مرتب فرمایا ہو انکے معاصر اہل قلم اس باب میں ان کے ہم مرتبہ نہیں ہیں، بلکہ انھیں ان سب پر فوقیت حاصل ہے، مگر اسلوب بیان نظر عقیدت میں کھٹکتا ہے، حضرت گیسو دراز اپنے مرشد کے دوستوں اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے نیازمندوں کیلئے ایسے الفاظ کس طرح استعمال کر سکتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ نقل در نقل میں کچھ کا کچھ ہو گیا:۔ یہ کلام خود رائی اور بے اعتنائی کا آئینہ لگتا ہے، اس میں نہ تحقیق ہے نہ کیف، نہ صوفیہ کے کلام کی سی لذت وانکسار ہے، حضرت گیسو دراز تو بڑی چیز ہیں کسی معمولی اہل دل سے بھی ایسے کلام کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے، اس میں ایسا کچھ ہے، جو ذوق کو گراں گزرتا ہے، مثلاً۔

(۱) حضرت محبوب الٰہیؒ کو شیخ نظام الدین سے یاد کیا ہے، اس کے برعکس ان کے پیر و مرشد مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے جب کبھی یاد فرمایا ہے، نہایت احترام سے یاد فرمایا ہے، حتیٰ کہ مطالعہ کرنے والے تک سر تسلیم جھکائے بغیر نہیں رہ سکتے، مگر خواجہ گیسو درازؒ کا بیان اس وصف سے معرا ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی معمولی شخص کا ذکر کر رہے ہیں،

(۲) خواجہ امیر حسن علاء سجزی کوئی ایسے ویسے شاعر نہیں تھے، یکتائے روزگار اور بے مثل شاعر گزرے ہیں، حضرت امیر خسروؒ جیسے باکمال انھیں برادرم امیر حسن کہہ کر یاد کرتے تھے، راج دربار میں انھیں وقار حاصل تھا، درویشی میں بھی آپ اپنی مثال تھے، خواجہ گیسو درازؒ کے پیر و مرشد مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے برادر طریقت اور بے تکلف دوست تھے، حضرت محبوب الٰہیؒ کے نیازمند، مخلص اور یاران اعلیٰ میں سے تھے، اور وہ ایسی کتاب کے مؤلف وجامع ہیں جو یادگار زمانہ ہے، اور آج تک مشعلِ راہ ہے، خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ ہر اعتبار سے لائقِ احترام ہیں، ایسے شخص کو امیر حسن شاعر کہہ دینا کہاں تک روا ہے۔

اسلام اور مذاق تصوف اس کی کہاں تک اجازت دیتا ہے۔

(۳) علت وسبب بتائے بغیر یہ حکم لگانا کہ ہمہ باد ہوا ست کہاں تک معقولیت پر مبنی ہو سکتا ہے، مذاق تصوف اسے کہاں تک برداشت کرتا ہے، حضرت امیر خسروؒ ایک نہیں دو مجموعۂ ملفوظات کے مولف ہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ کے نوعمری کے ساتھی (ص ۱۰۸) حضرت محبوب الٰہیؒ کو جان سے زیادہ عزیز (۳۰۲) اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مخلص وجان نثار تھے، وہ بادشاہوں سے وابستہ تھے، مگر شہنشاہ دین پر قربان تھے، وہ سر دے سکتے تھے، اپنے حضرت سے راز مخفی نہیں رکھ سکتے تھے، درویشی میں ان کا مقام اللہ اکبر، کون بتا سکتا ہے، کہ کیا ہے۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نہ داند جام وسندان باختن

ان پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، کہ زندگی کا کوئی گوشہ چھپا یا نہیں، آپ کی پوری زندگی نظروں کے سامنے ہے، کوئی کہہ سکتا ہے کہ باد ہوا کا کوئی جھونکا انھیں چھو کر نکلا ہے، اگر ایسے ایسے باد ہوا کی پیٹ میں آگئے تو۔ اے وائے بر حالِ ماشما، شیخ سعدیؒ علیہ الرحمۃ نے خوب فرمایا ہے ؎

گر نظر صدق را نام گنہ می نہی حاصل ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

ملفوظات کا شمار عبادتِ متعدی میں ہے، لازمی نہیں، اس کے لیے اخلاص بھی درکار نہیں پھر باد ہوا اور خواہشاتِ دلی کا تموج کیا بگاڑ سکتا ہے، اور باد ہوا کا اطلاق ان پر کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ محل نہ تنقید کا مقتضی ہے نہ تفصیل کا، بسبیل تذکرہ کچھ باتیں زبانِ قلم پر آگئی ہیں بلا شبہ آیندہ کا نقاد جب خواجہ گیسو درازؒ کے اسلوب وبیان کا

تجزیہ کرکے توازن کرے گا تو اسے بتکلف ہو گا یہ تسلیم کرنے میں کہ یہ جملے خواجہؒ موصوف ہی کے
فرمودہ ہیں، اور صحت کے ساتھ منقول ہوتے رہے ہیں۔ یہاں تو صرف اتنا کہنا ہے کہ
فوائد الفواد میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے اسلوب کو سنبھالے رکھنے میں خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ
کے کمال فن کو بڑا دخل ہے، ورنہ تقریر کے ضبط تحریر میں آنے کے بعد اثرات و کیفیات کا
برقرار رہنا کارے دارد ہے، اور ایسی توقع بے حاصل ہے۔ یہ بھی حادثہ ہے کہ کتاب
فوائد الفواد بھی ہم تک محفوظ نہیں پہنچی ہے۔

۶۔ قلمی کتابیں | قلمی کتابوں کو ان کی قدامت کے اعتبار سے بلکہ گوناگوں اوصاف کی بنا پر
قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور وہ فی الواقع ہوتی بھی ہیں لائق قدر، لیکن صحت کے اعتبار
سے ان میں وہ خوبی نہیں ہوتی، جو مطبوعات کا وصف ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ صحت
کا جو اہتمام مطبوعہ کتب کے لیے ہوتا ہے، اور ہو سکتا ہے، وہ قلمی کتب کے لیے ناممکن نہیں تو
دشوار تر ضرور ہے۔ یہی سبب ہے کہ قلمی کتابیں جو متعدد نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد
شایع کی جاتی ہیں۔ ان میں حواشی ہوتے ہیں، جو اختلاف نسخ کی نشان دہی کرتے ہیں بعض
جملے جو لکھنے سے کسی نسخے میں رہ جاتے ہیں، اور عبارت بے ربط ہو جاتی ہے، ان کا پتہ چل جاتا
ہے، اور خامی رفع ہو جاتی ہے، اسی طرح الحاقی عبارتوں کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ یہ
افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک کتب ملفوظات میں سے خیر المجالس کے سوا کوئی کتاب
صحت و مقابلہ سے مرتب ہو کر شائع نہیں ہوئی ہے۔ اور یہ بات عقیدت مندوں کے لیے
سخت لائق ندامت ہے۔ فوائد الفواد بھی صحت و مقابلہ کی محتاج ہے، جسے بہت اہم
مانا جاتا ہے۔

اختلاف نسخ | قلمی کتابوں کے مختلف نسخوں میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں ان کے اسباب

مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) کوئی لفظ یا جملہ کاتب سے نقل کرنے میں رہ گیا۔ جب کسی نے پڑھا تو منقول عنہ
موجود نہ ہونے کی صورت میں خود ہی مناسب سا کوئی لفظ لکھ دیا۔ یا یوں ہی رہنے دیا۔
بہر حال جو بھی تھا نقل در نقل ہوتا رہا۔ مگر اصل سے مختلف ہو گیا۔

(۲) امتداد زمانہ کے ہاتھوں کچھ عبارت مٹ گئی۔ اور قابل خواندگی نہ رہی۔ ایسی
صورت میں یا تو کسی نے اپنے صواب دید سے اس خلا کو پُر کر دیا۔ یا وہ یوں ہی نقل در نقل
ہوتا رہا۔ جس سے مفہوم اصلی تک رسائی مشکل ہو گئی۔ نایابی کی صورت میں اسی کو غنیمت
سمجھ لیا۔ اور بات کچھ سے کچھ ہو گئی ایسے تغیر و تبدل سے اختلاف نسخ لاحق ہوتا ہے، جو صحت
و مقابلے سے بہت کچھ رفع ہو سکتا ہے۔

(۳) یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوراق اس قدر از کار رفتہ اور کرم خوردہ ہو جاتے ہیں
کہ انھیں شامل رکھنا مزید ضرر کا باعث ہوتا ہے۔ لامحالہ انھیں نکالنا اور نظر انداز
کرنا پڑتا ہے، اگر کتاب نایاب یا کمیاب ہے تو اسی ناقص الحال پر اکتفا کرنا پڑتا ہے،
جو کچھ محفوظ ہو سکتا ہے محفوظ کر لیا جاتا ہے، میرے پاس بھی قلمی کتابوں کے کچھ اوراق
ہیں، جو میں نے محفوظ کر لیے ہیں۔

یہ اور اس قسم کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ جن سے ناقص نسخے رواج پانے لگتے ہیں
جو تبرکاً نقل در نقل ہوتے رہتے ہیں اور اصل سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ مگر ان پر جعلی
ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ نے امام ابو عبد الرحمٰن محمد سلمیؒ
نیشاپوری کی مشہور کتاب طبقات صوفیہ کے متعلق لکھا ہے۔

تصحیف و تحریف نویسندگان بجاے | لکھنے والوں کی تصحیف و تحریف

رسیدہ کہ دریسیاری از مواضع فہم	اتنی بڑھ گئی کہ بہت سے مقامات کا
مقصود بسہولت دست نمی داد	یا عبارتوں کا مقصد بسہولت گرفت
(نفحات الانس ص ۳)	میں نہیں آتا۔

یہی حال مروجہ کتب ملفوظات کا ہے۔ مولانا جامیؒ علیہ الرحمۃ نے اسی دشواری سے چھٹکارا پانے کے لیے نفحات الانس لکھی تھی جو اضافہ معلومات کے ساتھ طبقاتِ صوفیہ پر مبنی ہے۔ امتداد زمانہ کے ہاتھوں قلمی نسخوں کی حالت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، پھر بھی انھیں غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ مشائخِ چشت کے ملفوظات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ افضل الفوائد تالیف حضرت امیر خسروؒ کے ناشر کا بیان ہے۔

چوں کہ کتاب منقول عنہ قلمی بسیار غلط بود۔ واز آخر یک ورق چناں کرم خوردہ بود کہ درخواندن نمی آید۔ لہذا کتاب موصوف دریں جا تمام کردہ شد۔ نیز درصحت ہم کوشش تمام کردہ آید۔ (افضل الفوائد ص ۱۹۶ حاشیہ مطبع رضوی دہلی ۱۳۰۵ھ)

ایسا لگتا ہے کہ فوائد الفواد کو بھی ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جلد چہارم کی ۲۵ ویں مجلس کا آغاز چہارشنبہ ۲۷ ماہ مذکورہ سے ہوا ہے، مگر یہی آغاز اور یہی انجام ہے، اور کچھ بھی نہیں ہے، (ص ۱۶۶) بیان غالباً ضائع ہو گیا، مگر ناشر نے کچھ نہیں بتایا۔

(۲) افضل الفوائد کے ناشر سید امیر حسن دہلوی مرحوم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ نسخہ جس سے مطبوعہ نسخہ منقول ہے، اغلاط سے بھرا ہوا تھا، ناشر نے ان اغلاط کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہیں۔ اور ان کی اصلاح کہاں تک اصل کے مطابق ہے۔

(۳) ناشر کی اصلاحی کوشش کے باوجود یہ نسخہ بھی اغلاط سے پاک نہیں، املا کے

علاوہ کہیں کہیں عبارت بے ربط ہے۔ تاہم ناشر لائق شکریہ ہیں، کہ انھوں نے کمیاب نسخہ فراہم کیا۔ اور ان کی اس سعی جمیل کے بدولت ہمیں بھی استفادہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ اللہ پاک اجر عظیم عنایت فرمائیں۔

۷۔ تاریخی خلفشار ملفوظات کے نسخوں میں عموماً سنین اور تاریخیں۔ مہینے اور دن ایسے ملتے ہیں جو تقویم کے مطابق نہیں ہیں، یہ نقص کسی ایک میں نہیں سب ہی میں پایا جاتا ہے، حتیٰ کہ مشہور مشہور کتبِ تاریخ میں بھی یہ نقص ہے۔ مولانا ضیاء الدین برنیؒ کی تاریخ فیروز شاہی کے سنین کی سر سید مرحوم نے تصحیح فرمائی تھی۔ جو مطبوعہ کلکتہ کے حواشی میں موجود ہے، تاریخ فرشتہ نہایت متداول ہے، وہ بھی اس نقص سے مبرا نہیں، حضرت بابا صاحبؒ کا سنہ وفات فرشتہ مطبوعہ نولکشور میں ۶۰۰ھ لکھا ہے، قلمی نسخوں میں اس سے مختلف بھی ہے۔ یہ عام وبا ہے، اس کی بنا پر کس کس کتاب کو جعلی بتایا جا سکتا ہے، یہ صحیح ہے کہ تاریخی غلط اندراجات سے ملفوظات کے اعتماد کو نقصان پہنچتا ہے، مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں کو تقویت ہوتی ہے، ان ملفوظات میں تاریخ اور سنہ کے کچھ اندراج ملاحظہ ہوں۔

(۱) دن ہے مہینہ ہے سنہ ہے۔ تاریخ ندارد (فوائد ص ۱۵۲-۳۳۵)

(۲) دن۔ تاریخ مہینہ ہے، سنہ ندارد بیان مجلس ندارد (فوائد ص ۱۶۶)

(۳) ایک ہی تاریخ دو مجلسوں میں ہے مگر دن مختلف ہیں۔ (فوائد ۱۰۶-۱۰۸)

(۴) ۲۳ رمضان کی مجلس پہلے ہے، ۱۰ رمضان کی بعد میں۔ دن مہینہ اور سنہ ایک ہی ہے۔ (فوائد ص ۲۶-۲۹)

(۵) ۲۰ شوال پہلے ہے اور ۸ شوال بعد میں ہے، دن مختلف ہیں۔ (فوائد ص ۳۳۰-۳۳۳)

(۶) دن ہے، سنہ ہے، نہ مہینہ نہ تاریخ،

(۷) دن مہینہ اور سنہ ہے۔ تاریخ ندارد

(۸) دن تاریخ مہینہ ہے سنہ ندارد

(۹) دن ہی دن ہے نہ تاریخ نہ مہینہ نہ سنہ

(۱۰) دن تاریخ مہینہ سنہ سب کچھ ہے۔ مگر سب غلط۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اس کا سبب کیا ہے، بظاہر تو سبب وہی ہے، جس کا ذکر آچکا ہے کہ کتابت کی غلطیاں اور دیرینہ روزی کے اثرات۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیر الاولیاء (صفحہ ۹۱ سطر ۲ تا ۹) کی الحاقی عبارت کو کسی نے معتبر مان کر ترمیم کر لی ہو بہر حال تا وقتیکہ صحت و مقابلہ سے ملفوظات مرتب ہو کر شائع نہ ہوں، کسی کو اصل سبب قرار دینا قبل از وقت ہوگا۔

یہ واقعہ ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی نازک وقت پڑا ہے تو تصوف ہی نے دستگیری کی ہے اور گرتوں کو سنبھالا ہے، جو مخالفینِ اسلام اس رمز سے آگاہ ہیں، وہ طرح طرح سے صوفیانہ خیالات کی بیخ کنی کے درپے رہے ہیں، بظاہر کوئی تنظیم نہیں ہے بلکہ یہ راز درون پردہ ہے، آج کل ہند و پاک میں ملفوظات کے خلاف جو یورش بپا ہے، ممکن ہے اس کے پس پشت بھی یہی جذبہ کار فرما ہو۔ آیندہ کا مورخ بتائے گا کہ رازِ درونِ پردہ کیا ہے۔

میرے نزدیک اس گران قدر تہذیبی اور روحانی سرمایہ کے تحفظ کی کارگر تدبیر یہی ہے کہ کتبِ ملفوظات کو کمال صحت سے مرتب کر کے شایع کیا جائے، اور ان کے تراجم بھی مختلف السنہ میں شائع کیے جائیں، وہ عقیدت مند جو اولیاء اللہ سے عقیدت رکھتے ہیں اور زرِ کثیر صرف کرتے رہتے ہیں، اور اہلِ علم و بصیرت اگر متوجہ ہو جائیں تو یہ مشکل ...

آسان ہو جائے۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ ملفوظات کے خلاف جو ہنگامہ بپا ہے وہ اگرچہ باد ہوائی سہی لیکن تدارک ضروری ہے۔

ع کہہ دیا اخلاق نے کہنا جو تھا المختصر

۸۔ نقد و تنقید نقد و تنقید کا حق ادا نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ کتبِ ملفوظات صحت و مقابلہ سے مدون ہو کر سامنے نہ آئیں۔ تنقید نگار کو اپنے موضوع سے ہمدردی اور دلچسپی ہونی چاہیے۔ محض تخریبی نقطۂ نظر رکھنا تنقید نہیں تنقیص ہے، جانب داری سے حقِ تنقید ادا نہیں ہوتا، کتبِ ملفوظات سے متعلق جو تنقیدیں بروئے کار آئی ہیں، ان میں اصول نقد و تنقید کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ تنقید نگاروں سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں، تاہم ان سے استفادہ کرنا چاہیے کہ ان کی بدولت اصلاح حال کا رجحان بروئے کار آیا ہے۔

حاصل ہوئی آگاہی عشرت گہہ باطل سے ہم شمع اٹھا لائے سوئی ہوئی محفل سے

خدا کرے کہ اس رجحان کو عملی صورت میں آنا نصیب ہو۔

۹۔ عادتِ الٰہیہ ملفوظات کے مطالعہ کے دوران یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ عادتِ الٰہیہ یہ ہے کہ جب قوم و ملک کی حالت اس کی مقتضی ہوتی کہ ان میں کسی نبی کی بعثت ہو، تو نبی محترم کو ان اوصاف سے بالاتر اوصاف سے متصف فرما کر مبعوث فرمایا ہے، جن سے اس عہد کے ممتاز ترین اشخاص متصف تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کو ساحری اور جادوگری کے عہد میں مبعوث فرمایا تو یدِ بیضا اور عصائے موسیٰ کا ایسا معجزہ عنایت فرمایا۔ جس کے مقابلے میں ساحری ہیچ ہو کر رہ گئی۔ اور ساحروں کی ہوا اکھڑ گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام طب و حکمت کے عہد عروج میں مبعوث ہوئے،

انھیں اس معجزے سے نوازا کہ وہ بحکم الٰہی اندھوں کو بینائی عطا فرماتے، کوڑھیوں کو شفا عنایت فرماتے اور مردوں کو قُمْ بِاِذْنِ اللہ کہہ کر زندہ کر دیتے تھے، ان کے سامنے اس عہد کے حاذق اطباء اور خواص الادویہ کے ماہر سپر انداز ہوگئے۔

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام پاک کا معجزہ عطا ہوا تھا، جس کے آگے فصحائے عرب عاجز و حیران تھے۔ جو اپنی شیوا بیانی کے مقابلے میں تمام عالم کو گونگا جانتے تھے، ان کو اعتراف کرنا پڑا۔ لیس ھذا بکلام البشر یہ کلام تو اس پایہ کا ہے کہ انسانی کلام اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔

اولیا اللہ جو علوم ظاہری و باطنی سے مالا مال اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب و جانشین ہوتے ہیں اور انبیائے بنی اسرائیل کے مثل ہوتے ہیں، جب انھیں کسی قوم کی خدمت تفویض ہوتی ہے، تو انھیں بھی ان اوصاف سے نوازا جاتا ہے جو اس قوم کے ممتاز ترین اشخاص کے اوصاف سے بالاتر ہوتے ہیں

خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین چشتی کو ہندوستانی قوم کی خدمت تفویض ہوئی اور آپ ہندوستان تشریف لائے۔ تو اس عہد میں ہندوستانی اذہان، جوگیوں اور سنیاسیوں کے دام میں جکڑے ہوئے تھے، جو فن ساحری میں کمال رکھتے تھے۔ جیپال جوگی اور شادی دیو سنیاسی سرفہرست تھے، انھوں نے خواجۂ بزرگ کو ناکام کرنے کے لیے جیسے جیسے جتن کیے وہ شہرۂ آفاق ہیں۔ آخر کار ناکام ہوئے، اور خواجۂ بزرگ کی غلامی میں پناہ لی بزرگان چشت جنھوں نے اس عہد میں اور اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک ہندوستان میں رشد و ہدایت کی شمع روشن رکھی اور مخلوق کی خدمات انجام دیں، انھیں ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا، ان کے ملفوظات میں خرق عادت کا ہونا تعجب خیز نہیں بلکہ نہ ہونا حیرت انگیز

انھیں نظر انداز کر کے کوئی مورخ و محقق اور نقاد نہ تو صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ نہ صحیح طور پر استفادہ کر سکتا ہے۔

۱۰۔ اخذ و اقتباس | قلمی کتب سے اور ان کے ایسے نسخوں سے جو صحت و مقابلہ کے ساتھ شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اخذ و اقتباس میں کامل شعور اور پوری احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصنف کے اسلوب اور اس کے رجحان سے کامل آگاہی درکار ہوتی ہے تاکہ ہر وہ عبارت جو مصنف کے رجحان اور اس کے اسلوب کے مطابق نہ ہو۔ ذوق سلیم کی گرفت میں آجائے۔ اور الحاق و تحریف نظر سے اوجھل نہ رہے۔ یہ وصف پیدا ہوتا ہے۔ مطالعہ کثیر اور مصنف کے اسلوب کی آگاہی سے۔ ذہن رسا اور نظر دوربین بھی درکار ہوتی ہے، اگر اخذ و اقتباس میں پوری احتیاط سے کام نہیں لیا جائے گا تو الحاق بھی مقتبس ہو جائیں گے۔ مذہبیات سے متعلق وہ کتابیں جن سے مختلف الفقیہ طبقات کو اختلاف رہا ہے، ان میں بھی الحاق و تحریف کا عمل ہو سکتا ہے، ایسے بھی ہوئے ہیں، جنھوں نے موضوع حدیثیں بنائی تھیں، محفوظ ترین کتاب صرف اللہ ہی کی کتاب ہے، جس کا وہ خود محافظ ہے۔ لہٰذا اخذ و اقتباس میں پوری احتیاط برتنی چاہیے۔

۱۱۔ بیانِ واقعہ | یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ بیانِ واقعہ سے مراد واقعہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ اکثر و بیشتر وہ نتائج اور تاثرات مراد ہوتے ہیں جو اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ ماہر زبان داں اس نکتے سے خوب واقف ہیں۔ مثنوی مولانا رومؒ، منطق الطیر، اور گلستان و بوستان اس وصف سے مالا مال ہیں، اس نکتے سے ناواقفیت واقعات کی تفہیم میں سخت مخل ہوتی ہے۔ ملفوظات میں بھی

اسلوب کی یہ خوبی کار فرما ملتی ہے۔ اور دیگر علوم و فنون میں بھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تفہیم القرآن کے باب میں فرمایا ہے۔

"ان تمام قصوں سے یہ مقصود نہیں کہ ان واقعات سے آگاہی ہو جائے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان سے سننے والوں کے ذہن شرک اور معاصی کی برائی کی جانب منتقل ہو جائیں" (الفوز الکبیر ص ۶۶)

مطالعہ ملفوظات کے دوران اس نکتے کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ورنہ ذہن واقعہ کی تہہ تک پہنچ نہ سکے گا۔ اور مقصودِ اصلی حاصل نہ ہوگا۔

(باقی)

بزم صوفیہ

بکثرت اضافوں کے ساتھ بزم صوفیہ کا دوسرا ضخیم ایڈیشن، جس کے آخر میں آٹھویں صدی کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالحق توشہ ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تعلیمات و ملفوظات کا مستقل اضافہ ہے۔

اس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابوالحسن ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، خواجہ گنج شکرؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، شیخ بوعلی قلندرؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ، (کچھوچھہ) سید گیسو دراز وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات و تعلیمات و ارشادات پیش کیے گئے ہیں۔ جن کو پڑھ کر روح میں بالیدگی اور ایمان میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

مرتبہ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت ۔ ۵۰ — ۱۶

امیر خسروؒ کی صوفیانہ شاعری

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

امیر خسرو کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ عشق کے دلدادہ، شعر و سخن میں یار کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر، اور چشم یار کے سرشار رہے، مگر انھوں نے کسی صنفِ نازک کو اپنا معشوق نہیں بنایا، ان کی پاکیزہ زندگی مجازی عشق سے بالکل پاک رہی، مجازی عشق کی آلودگی سے وہ مبرا رہے، تو ان کے عشق حقیقی میں تقدس پیدا ہوگیا، جو مختلف صورتوں میں تبدیل ہوتا رہا، اسی لئے جب اپنی شاعری میں عشق الٰہی کا اظہار کرتے ہیں، تو اس میں عارفانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے،

ان کا کوئی دیوان اور کوئی مثنوی حمد سے خالی نہیں، جن میں جہاں ان کے شاعرانہ کمالات کا اظہار ہے، وہاں ان کے روحانی جذبات ان کے قلب کے اندر سے امنڈتے نظر آتے ہیں، اپنی پہلی مثنوی قران السعدین لکھی تو حمد سے اس کا آغاز کرتے ہوئے فخر سے کہتے ہیں،

شکر گویم کہ بتوفیقِ خداوند جہاں
بر سرِ نامہ ز توحید نوشتم عنواں

توحید ان کی ہر حمدیہ نظم کا موضوع رہا ہے، جس سے نہ صرف ان کا جذبۂ ایمانی ظاہر ہے، بلکہ چشتیہ سلسلہ کا یہ مسلک بھی عیاں ہے کہ وہ راہ سلوک میں اس پر خاص طور

سے زور دیتے تھے، امیر خسرو اپنی مثنوی قران السعدین (ص ۱) میں یہ کہتے ہیں کہ

واجب اول بوجودِ قدم ‏ ‏ ‏ نے بوجودے کہ بود از عدم

یہ گویا سورۂ اخلاص کا خلاصہ ہے، یعنی خداوند تعالیٰ واجب ہے، قدیم ہے، اس کا وجود کسی وجود سے نہیں ہوا، اس شعر میں کلامی رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے، یعنی اگر اس کی ذات واجب اور قدیم ہے تو اس کی صفات بھی واجب اور قدیم ہیں، ہر حمد میں واجب الوجود اور قدیم بالذات کا مسئلہ ضرور زیر بحث لایا جاتا ہے، اس کے بعد اُس کی ربوبیت کا ذکر ہوتا ہے، اس لئے امیر خسرو کہتے ہیں کہ اس کی ذات کی معرفت کے لئے کسی علت اور معلول کی ضرورت نہیں، وہ تحقیق کے ذریعہ سے نہیں معلوم کیا جا سکتا، اگر توفیق الٰہی حاصل ہے، تو اس کی ذات بھی معلوم ہو سکتی ہے، اس کی ذات میں وحدت ہے، البتہ اس کی صفات میں کثرت ہے، مگر اپنی تمام صفات کے تمام تغیرات کے امکانات سے منزہ ہے، اور اس کو ابدی بقا حاصل ہے، (قران السعدین ص ۲ و ۳)

رخش علل در رہش افگندہ سم ‏ ‏ ‏ علت و معلول دروہ ہر دو گم

کس نبرد راہ بہ تحقیق او ‏ ‏ ‏ در برد آ لاگہ بہ توفیقِ او

ثابت مطلق بہ صفات احد ‏ ‏ ‏ زندہ و باقی بہ بقائے ابد

غیرت غیر از قدمش دور سیر ‏ ‏ ‏ پاک ز امکانِ تغیر چو غیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج سے واپس آئے تو صحابہ نے پوچھا کہ کیا رسول اللہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ وہ تو نور ہے جو کسی پیکر میں دیکھا نہیں جا سکتا، اس کو امیر خسرو اس طرح شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہیں (ص ۳)

چشم جہت بینش چہ بیند بنور ‏ ‏ ‏ تا نکند خود جہت از دیدہ دور

اللہ تعالیٰ کائنات کا صانع ہے، مگر اس کائنات میں دکھائی نہیں دیتا، وہ ہر جگہ موجود ہے لیکن کہیں بھی نہیں ہے، اس کو کس خوبی سے بیان کرتے ہیں، (ص ۳)

بستہ مکاں را بجہات صفات ‏ ‏ ‏ ہم ز مکاں فارغ و ہم از جہات

بے ہمہ جا و ہمہ جا در وں ‏ ‏ ‏ در ہمہ جا و ز ہمہ جا برون

کہتے ہیں کہ اسی کی رہنمائی سے اپنی اور خداوند تعالیٰ کی ذات کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے، (ص ۶)

معرفتش گر نشدے رہنمائے ‏ ‏ ‏ نے ز خود آگہ بدے نے از خدائے

امیر خسرو کے یہاں حمد میں سراسر وہی توحید ہے جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام پاک کے ذریعہ سے دی ہے یعنی اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، خالقِ عالم ہے، صانعِ کائنات ہے، وہ انسانی عقل و فہم سے بالاتر ہے، ہر جگہ اور ہر حال میں موجود ہے، اس کے وجود میں کوئی شک نہیں، یہ گوناگوں عالم، یہ رنگا رنگ کائنات، یہ آسمان، یہ زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ سمندر اور یہ پہاڑ وغیرہ ایک ہی خالقِ کائنات کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں، عرش سے فرش تک جو کچھ ہے، اسی کا ہے، اس پر اس کی حکمرانی ہے، وہ ہر قسم کی صفاتِ عالیہ، اوصافِ کمالیہ اور محامدِ جمیلہ سے متصف ہے، وہ جمال، جلال اور باکمال بن کر ہر طرف نمودار ہوتا رہتا ہے، توحید کی انہی سادہ تعلیمات کو امیر خسرو اپنی حمد میں مختلف صورتوں سے پیش کرتے رہتے ہیں جن کو پڑھنے میں لطف اُن کی شاعرانہ بلاغت کی وجہ سے دوبالا ہو جاتا ہے،

مجنوں لیلیٰ میں کہتے ہیں کہ وہی دل کے راز کا خزانچی ہے، عقل اسی سے ملتی ہے، وہ دوربینوں کا دیدہ کشا ہے، تہی نشینوں کو خزانہ دینے والا ہے، بندہ نواز ہے، مغز کو

پوست دینے والا ہے، بہارِ خنداں کا جلوہ گر ہے، ہوش مندوں کی آنکھوں کو بینائی دینے والا ہے، جسم کا صانع ہے، روح کا خالق ہے، مجروح سینوں پر مرہم رکھنے والا ہے، (ص ۲-۱)

اے دادہ بدل خزینہ راز　　عقل از تو شدہ خزینہ پرداز

اے دیدہ کشائے دوربیناں　　سرمایہ دہ تہی نشیناں

اے بندہ نواز بندگی دوست　　زآنِ تو جان زمغز تو پوست

اے جلوہ گر بہارِ خنداں　　بینا کن چشم ہوش منداں

اے صانعِ جسم و خالقِ روح　　مرہم نہ سینہ ہائے مجروح

شیریں خسرو میں اللہ تعالیٰ کی تکوینی قوت کے بارہ میں کہتے ہیں، کہ یہ کونین کی صنعت اس کے باغ کا محض ایک پھول ہے، یہ تو آسمان کی حیثیت محض اس کے چراغ کا دھواں ہے، اس نے اپنی عنایت سے کلک تقدیر کے ذریعہ کائنات کو تو لکھ ڈالا ہے، اور اس کو دنیا کے سپرد کرکے بے نیاز ہو گیا ہے، پھر بھی اس پر لگام لگائے ہوئے ہے،

(ص-۳)

دو کون از صنع یک گل ز باغے　　ز ملکش نہ فلک دود چراغے

بعنوانِ عنایت کردہ تحریر　　حسابِ کائنات از کلکِ تقدیر

سپردہ در جہاں بے نیازی　　ارادت را عنانِ کارسازی

آئینۂ سکندری کی حمد میں کہتے ہیں، کہ ازل سے ابد تک اسی کی بادشاہی ہے، وہی اول وہی آخر ہے، عقل کو وہی کنجی دینے والا ہے، آدمی کو وہی بلند کرنے والا ہے، کائنات پر وہی خط کھینچنے والا ہے، وہی ضمیر کا رازدار ہے، وہی درماندگی میں دست گیر ہے،

جہاں بادشاہا خدائی تراست　　ازل تا ابد بادشاہی تراست

توئی اول و آخر جملہ چیز　　نہ آغاز داری نہ انجام نیز

درِ کار روانی تو کردی پدید　　خرد را بر آں در تو دادی کلید

فلک را تو بستی گرہ در جہات　　تو راندی قلم بر خطِ کائنات

توئی راز دارِ ضمیرِ ہمہ　　بدرماندگی دست گیر ہمہ

دول رانی خضر خاں میں اللہ تعالیٰ کی جمالی صفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ اسی نے چین کے حسینوں اور دوسرے خوبرویوں کو اس لئے پیدا کیا کہ عشق ظاہر ہو، حسینوں کی آنکھوں کو یہ کرشمہ عطا کیا کہ آہو ہو کر شیر کا شکار کریں، ماہرویوں کی زلفوں کو اس لئے دراز کیا کہ محبت کرنے والوں کے دل مشوش ہوں، وہ تو صورتہائے زیبا کا نقاش ہے، اسی لئے مٹی کو اس نے دیبا کی شکل عطا کر دی (ص-۲)

بتانِ چین و خوبانِ طرازی　　پدید آورد بہر عشق بازی

کرشمہ داد چشم نیکواں را　　شکار شیر فرمود آہواں را

مسلسل کرد زلفِ ماہ رویاں　　مشوش روزگار مہر جویاں

زہے نقاش صورتہائے زیبا　　کہ زشتِ خاک ازو شد رو بزیبا

پھر اس حمد میں تمام پیغمبروں کی زندگی کے واقعات کو ایک ایک شعر میں سمیٹ کر بانی فضائل کی تصویر کھینچ دی ہے، اس میں آدمؑ و ابلیس، طوفانِ نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ کی تلاش وحدانیت، حضرت یوسفؑ کی گمشدگی پر حضرت یعقوبؑ کی پریشانی، حضرت موسیٰؑ کا کوہِ طور پر نورِ خداوندی دیکھنے، حضرت زکریاؑ کے سر پر آرہ چلانے، حضرت عیسیٰؑ کے روح اللہ ہونے، اور ہمارے رسول اللہؐ سے شق القمر کے معجزہ کے صادر ہونے وغیرہ کے واقعات کا سارا ذکر آگیا ہے، یہ ایجاز کا عمدہ نمونہ ہے، (ص ۳)

بآدم داد شمعِ روشنائی | نہاد ابلیس را داغِ جدائی،
چو بر نوح از تفِ غیرت زند برق | بطوفاں مردمِ چشمش کند غرق
بنوری بخشد ابراہیم را راہ | کہ در چشمش نیاید انجم و ماہ
چو خواہد عینِ یعقوب از پسر نور | زعینش گر قرۃ العینش کند دور
کند بر موسیٰ آن راز آشکارا | کہ تابِ آن نیارد کوہ خارا
یکے را بر گلو راند بلا رک | یکے را آرہ بر بالائے تارک
چو تابِ مہر بر روح اللہ فشاند | ز مہر و دوستی جانِ خودش خواند
چو مہرش زد بہ نفسِ مصطفےٰ دست | چناں صد جاں بتار موئے او بست
جمالی داد احمد را بدرگاہ | کہ چاک افتاد زاں در سینہ ماہ

خداوند تعالیٰ نے جنیدؒ اور ہم شبلیؒ، اور منصورؒ کو جس طرح نوازا اس کا بھی ذکر ہے، (ص ۳)

گے بخشد جنیدے را کلاہے | کہ تنہا زاہلِ دل باشد سپاہے
گہ او ہم برد حبلِ عقیدہ | دہد از خیل حب اللہ طویلہ
گے با شبلیے آن ہمت کند ضم | کہ صید خویش نہ پندد دو عالم
گے در پیش شاہ دردان اسرار | نماید جلوہ منصور بر دار
ہمہ دانند کہ ایں رازِ نہاں چیست | چہ داند مردمِ گم گشتہ کاں چیست

مثنوی ہشت بہشت میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ یہ آفرینش اسی کی تحریر ہے، جو کچھ ہے اسی کی پیدا کی ہوئی ہے، اُس نے جو کچھ بنایا، اس کو یہ دنیا والے سمجھ نہیں سکتے، اُن کے خیال میں اُس کی باتیں نہیں آسکتی ہیں، یہ آدمی محض مٹی

کا پتلا ہے، وہ خداوند تعالیٰ کے راز کو نہیں جان نہیں سکتا ہے، دنیا میں جو کچھ ہے اس کو کوئی شخص نہیں جان سکتا ہے، وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ باتیں صرف خدا ہی جانتا ہے، یہ سب کچھ کن کا ظہور ہے (ص ۲-۱)

آفرینش رقم کشیدہ تست | ہر چہ جز تست آفریدۂ تست
در نیائی بفکرِ عالمیاں | در نگنجی بوہم آدمیاں
آدمے کیست خاک بے سروپاے | کو بداند خداے راچو خداے
ہر چہ اندر جہاں نداند کس | ہمہ دانند کاں تو دانی و بس
ساختی از قضا جریدہ راز | بستی از حرف کاف و نونش طراز

پھر لا الٰہ الا اللہ کی توضیح اس طرح کرتے ہیں کہ لا ایک اژدہا بن کر بہت سے خداؤں کو کھا گیا، اس لا نے عارفوں کو بڑے بڑے خیالات عطا کئے، خدا ہے بھی نہیں بھی ہے کھلا ہوا بھی ہے، اور چھپا ہوا بھی ہے، وہی سب کچھ ہے، اس کے کہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، وہ تھا، اور کوئی چیز نہیں تھی، وہی رہے گا، اور کچھ بھی نہیں رہے گا،

لاے توحید اژدہاست بپاے | کہ خدایان خورد و بغیرِ خدائے
اندراں لائے معرفت پیشہ | لام الف گشت پاے اندیشہ
ہست بے نیست آشکار و نہفت | ہم تو ئی جز ترا نشاید گفت
تو بدی و نبود ایں ہمہ چیز | ہم تو مانی و کس نماند نیز

امیر خسرو کے ایسے اشعار میں کہیں کہیں وحدۃ الوجود کی بھی کچھ بحث آگئی ہے، مگر اُن کے یہاں وحدت الوجود کا وہ فلسفیانہ غلو نہیں، جو بعد کے صوفیوں اور شاعروں کے یہاں پیدا ہو گیا تھا، اور اس کی بعض ایسی تعبیریں کی گئیں، جن سے یہ مسئلہ متنازعہ فیہ

بن گیا ہے، امیر خسرو کی حمد میں واجب الوجود، ربوبیت، تخلیق، اور عبد و معبود کے تعلقات کے ذکر میں وہی ساری باتیں آئی ہیں، جو اسلام کی سادہ تعلیمات کے مطابق ہیں، ان میں فلسفیانہ رنگ پیدا نہیں ہونے پایا ہے، اسی لئے اس کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی، البتہ اُن کے بیان کرنے میں اپنی سخنوری کی جو خسروانی دکھائی ہے، اس سے کہیں کہیں مثلاً غامض اور دقیق نظر آتا ہے، گو مسئلہ کی نوعیت کے لحاظ سے یہ سادہ ہی ہے، اور یہی مسلک خواجگان چشت کا رہا، جنھوں نے توحید کو عارفانہ رنگ میں مزور پیش کیا، مگر اس میں فلسفیانہ رموز و نکات پیدا نہیں کئے،

دول رانی خضر خاں کی حمد میں کہتے ہیں، کہ اُن کی آنکھیں ایسی ہو جائیں کہ وہ صرف خداوند تعالیٰ کا دیدار ہی دیکھیں اور اُن کی قسمت بنتی رہے، وہ اپنی ایسی زندگی کے خواہاں ہوتے ہیں کہ جس میں وہ خدا ہی کو ڈھونڈتے رہیں اور اسی کی آرزو لے کر مر جائیں، اُن کے لئے اس کی ذات کے سوا کوئی اور مقصود نہ ہو، پھر وہ ایسی ہمت چاہتے ہیں، کہ افلاک کے راز کو معلوم کر سکیں، وہ خدا ہی کی راہ پر چلنے کے خواستگار ہوتے ہیں، اور ایسی کنجی چاہتے ہیں جس سے خداوند تعالیٰ کی رحمت کا دروازہ کھل سکے، کہتے ہیں کہ وہ اس کی اطاعت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، تو پھر ان کو ایسی توفیق ہو کہ وہ اسی کے لئے سجدے میں پڑے رہیں، وہ خداوند تعالیٰ سے ایسی رہنمائی کی بھی خواہش کرتے ہیں کہ شیطان ان کو بہکا نہ سکے، وہ ایسی زندگی کی تمنا کرتے ہیں کہ جس میں اُن کا دل زندہ رہے،

کشادہ کن چناں چشم امیدم | کہ بخت آرد زدیدارت نویدم
چناں دہ مرا در جستجو ہیت | کہ میرم تا زیم ور آرزو یت
بداں مقصود خواہش بخش راہم | کہ از تو جز تو مقصودی نخواہم

زہمت نردبانی نہ دریں خاک | کہ بتوانم شدن بر بام افلاک
امیدی دہ کہ رہ سویت نماید | کلیدی دہ کہ در سویت کشاید
چو دادی از پئے طاعت وجودم | بہ طاعت بخش توفیق سجودم
بہ کاری رہنمونی کن دلم را | کہ نہ سپارد بہ شیطاں حاصلم را
مرا با زندگانی بخش یاری | کہ تا جاں دانم دل زندہ داری

توحید کی نغمہ سرائی کے بعد وہ مناجات بھی لکھتے ہیں جس میں وہ اپنی عاجزی، بندگی اور عبودیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں اُن کا وہ سوزِ عشق بھی نظر آتا ہے جس کے لئے وہ مشہور ہے، مطلعِ انوار کی پہلی مناجات میں کہتے ہیں کہ وہ کیا ہیں محض خاکِ زبوں ہیں، کچھ نہیں، مگر پیدا کر دیئے گئے، اپنی ہستی کو خدا کے ساتھ یاد کرنے میں تو اُن کو اپنی ہستی سے شرم معلوم ہوتی ہے، وہی باقی رہنے والا ہے، اور آدمی تو فانی ہے،

من کہ بہم خاکِ زبوں آمدہ | صورتے از نیست بروں آمدہ
گر کنم از ہستی خود با تو یاد | از خود و ہستی خودم شرم باد
گر ز تو موجود نباشد بہ زیست | آدمی فانی و معدوم کیست

دوسری مناجات میں کہتے ہیں کہ اُن کا نفس سزا کا مستحق ہے، خدا ہی اس کو اپنی رحمت سے نواز سکتا ہے، وہ نہ نوازے گا تو کون نواز سکتا ہے، وہ اس دنیا میں گم ہو کر رہ گئے ہیں، خدا ہی راستہ دکھا سکتا ہے، وہ تو دوزخ کی زنجیر کے لائق ہیں، مگر وہ امید رکھتے ہیں، کہ خدا ہی کوثر کا طوق اُن کے گلے میں ڈال سکتا ہے، پھر دعا کرتے ہیں کہ پل صراط پر سے وہ سلامتی کے ساتھ گذر جائیں،

نفس مرا گوست سزائے گداخت — گر نہ نوازی تو کہ خواہد نواخت
گم شدہ گانیم دریں تنگ نائے — رہ تو نمائی کہ توئی رہنمائے
گرچہ بزنجیر درک در خورم — طوق دہ از سلسلۂ کوثرم
رہ بہ صراطم قدمے مستقیم، — تا زپل آں سوئے گرایم سلیم

پھر اس کی تیسری مناجات میں کہتے ہیں کہ اگر ان کا دامنِ امید خدا کے کرم سے پُر ہے تو یہ اُن کے لئے نعمتِ جاوید ہے، وہ چاہتے ہیں کہ تمام لوگوں سے منہ موڑ کر خدا کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اگر انھوں نے خدا کو پا لیا، تو سب کو پا لیں گے، پھر کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی بخشش ہے، اس کے لئے ان کا دل ایسا ہو جائے کہ وہ کسی حال میں خدا کی نعمتوں کے ناشکر گذار نہ ہوں۔

اے ز تو پُر گشتہ دامنِ امید ما — وز کرمت نعمتِ جاوید ما
از ہمہ کس سوئے تو رو تافتم — تا ہمہ یابم چو ترا یافتم
زاں ہمہ بخشش کز تو سوئے ماست — گرچہ سپاسش نہ بہ بازوئے ماست
نیز قوی کن بدلم ایں اساس — تا نبوم در رہ تو نا سپاس

مجنوں لیلیٰ میں مناجات لکھتے وقت زاری کرتے ہیں کہ گنہگاروں کی تقصیر خدا ہی معاف کر سکتا ہے، وہ ایک عاجز بندہ ہیں، اُن کی عاجزی خدا ہی کے سبب سے ہے، وہی دور کر سکتا ہے، پھر گڑگڑاتے ہیں کہ وہ پست اور لاپروا ضرور ہیں لیکن وہ امید رکھتے ہیں کہ خدا اُن کو اپنے سے دور نہ کرے گا، پھر کہتے ہیں کہ اُن کے دل میں خدا کی یاد ایسی آ جائے کہ وہ اپنی ہستی کی یاد نہ کریں، وہ اس کے بھی خواہاں ہوتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کے گلشن میں وہ ایک نہال بن کر رہیں، معصیت کی بھٹی میں جلنے کے لئے چھوڑ نہ دیئے جائیں،

اے قدرت پذیرِ عذرخواہاں — عفو تو شفیع برگناہاں
خسرو کہ کمینہ بندۂ تست — در ہر چہ رفت فگندۂ تست
بردار ز خاک رہ کہ پستم — از دست رہا مکن کہ مستم
از یاد خودم کن آں چناں شاد — کز ہستی خود نیایدم یاد
در گلشنِ قدس کن نہالم — مگذار بہ گلخنِ وبالم

مثنوی ہشت بہشت (ص ۲) میں دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ میرے سر سے خسروانہ خیال دور کر دے، میری روشنی میں اپنی غلامی کی خاک بھر دے، اپنی بے نیاز درگاہ کے علاوہ تمام لوگوں کے دروازے سے بے نیاز کر دے، تیرے راستے پر چلنے کے علاوہ کسی اور کی طرف رُخ نہ کروں،

دور کن باد خسروی زسرم — پُر کن از خاک بندگی بصرم
بے نیازم کن از در ہمہ کس — جز ز درگاہ بے نیازی و بس
آنچناں رہ بخویش کن بازم — کز تو با دیگرے نپردازم

شیریں خسرو کی مناجات (ص ۶) میں کہتے ہیں کہ مجھ کو ایسی بلند ہمت عطا کر کہ دونوں جہان سے آزاد ہو کر دل تیرے ہی طرف لگائے رکھوں، صرف اپنی یاد میں اس طرح مشغول رکھ کہ اس سے اس طرح خوش رہوں کہ پھر کوئی اور میری یاد میں نہ آئے، میری آنکھ کی تپلی میں ایسا نور عطا کر دے، کہ کسی وقت بھی دور نہ ہو اور نہ مجھ کو اپنے سے ایسا قریب کر دے کہ میں خود اپنے سے ہمیشہ دور رہوں،

چناں دہ پایۂ ہمت بلندم — کہ از ہر دو جہاں دل با تو بندم
بیاد خویش کن زاں گونہ شادم — کہ نایدہیچ گہ از خویش یادم

چناں دہ مردم چشم مرا نور کہ نبود ہیچ گاہ از مردمی دور
چناں نزدیک خویشم کن یگانہ کہ از خود دور مانم جاودانہ

آئینۂ سکندری (ص ۲) کی مناجات میں کہتے ہیں کہ اے اللہ مجھ کو دنیا میں اس طرح بیدار رکھ کہ عارف بھی مجھ کو سویا ہوا نہ سمجھیں، میرے زخمی دل کو اپنا شناسا ایسا کر دے کہ اپنے کو پہچانتا رہوں، اپنی یاد سے میرے سینہ کو پُر نور کر دے، تاکہ کسی حال میں تجھ کو فراموش نہ کروں،

چناں دار بیدارم اندر جہاں کہ خفتہ نخوانند کارآگہاں
شناسا چناں کن دلِ ریش را کہ بشناسد اندازۂ خویش را
زیادِ خودم سینہ پُر نور کن فراموشیِ خود ز من دور کن

امیر خسرو نے اپنے ہر دیوان کے شروع میں بھی حمد کہی ہے، اُن کے حمدیہ قصائد میں مضامین تو وہی ہوتے ہیں، مگر اپنی قادر الکلامی سے اُن کے پیش کرنے میں ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل نئی بات کہہ رہے ہیں جو پہلے نہیں کہہ سکتے تھے،

نہایۃ الکمال کی جو حمد ہے اس کا مطلع یہ ہے کہ

سپاس آں کردگاری را کہ شد ز امرش جہاں پیدا
نہاں از دیدۂ پیدا و در چشم نہاں پیدا

پھر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا اس پر یقین کرنے کے سوا وہم اور گمان کا دخل نہ ہونا چاہئے، اس کا جمال تو سب کو نظر آتا ہے، مگر اس کا راز انسانی عقل سے نہیں کھل سکتا ہے، اس کا نشان ہر جگہ ہے، مگر وہ خود بے نشان ہے اس نے جو کچھ پیدا کیا، کوئی نہ کوئی اس کا مستحق ہے، کوئی اونی کمل کا مستحق ہے تو کوئی پرنیاں کا سزاوار،

انسان کو صاحبِ اختیار ضرور بنایا گیا ہے، مگر اُس کے لئے دوزخ اور جنت بھی بنائی گئی، یہ بھی اس کی قدرت ہے، کہ اس سے کسی مریض کو شفا ہو جاتی ہے، لیکن کسی مریض کو اس سے اس کی ہڈی میں بخار ہو جاتا ہے، زہر انسان کی جان کا دشمن ہے، مگر جذامیوں کے لئے وہ دوا بھی ہے،

گمانہا گم شدہ در وے یقینِ گم یقیناں کہ در صدق یقین ست نہ در کذب گماں پیدا
جمالش از ہمہ پنہاں و رازش از خرد پنہاں نشانش در ہمہ پیدا و دانش بے نشاں پیدا
سزا وارست ہر کس بہر چیزے زاں سبب کردہ ز بہر ایں گلیم و بہر او را پرنیاں پیدا
بشر را اختیارِ فعل دادست و بہشت بہر او کہ ہم دار العذاب آمد و ہم دار الجناں پیدا
گیا ہے کاں شفا بخشد یکے بیمار را در تن دگر بیمار را زو تپ شود در استخواں پیدا
چناں زہر کشندہ کوست تن را دشمنِ جانی شدہ مجذوم را داروی جسم و جاں پیدا

آخر میں کہتے ہیں کہ جب اُن کی روح کا قابض اُن کے پاس آئے تو وہ اس دنیا سے سلامتی کے ساتھ رخصت ہوں، اسی بات کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں،

ہمیں حاجت کہ با ایماں بری از عالم بیروں چو گردد قابضِ ارواح بچشم ناگہاں پیدا

اپنی قادر الکلامی زورِ طبع اور غیر معمولی ذہانت اور لیاقت کے سہارے استادانِ فن کی تقلید میں بھی حمدیہ قصیدہ کہتے رہے، مثلاً غرۃ الکمال میں جو حمد لکھی ہے وہ سنائی کے تتبع میں ہے، پھر کبھی پوری غزل حمد میں کہہ جاتے، مثلاً اپنے دیوان بقیہ نقیہ کی ایک غزل میں اللہ تعالیٰ کی بے نیازی سے متعلق کہتے ہیں، کہ انسان کی باکمال عقل بھی اس کی صفات کو پا نہیں سکتی، وہ ایسا بے نیاز ہے کہ اگر اس کے دروازے پر تمام لوگ اور دنیا کے تمام ممالک برباد ہو کر خاک ہو جائیں تو بھی اس کو ملال نہ ہوگا، اس کی کبریائی کا کنگرہ لامکاں سے بھی بلند ہے، ہمارے

خیال کا پرندہ بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی بے نیازی ایسی ہے کہ سینکڑوں حسین تشنہ رہ جائیں، تو اس کو فکر نہیں ہوتی، کہ ان کو آبِ زلال مل جائے، اس کے جلوہ کا تخت گاہ تو انسان کا دل ہے، جہاں وہ دن رات قریب رہتا ہے، لیکن چشمِ خیال اس کا جلوہ نہیں دیکھ سکتی، اس کے چمن کے سزاوار تو حضرت جبرئیلؑ بھی نہیں، پھر اس دنیا کے گل چیں اس کے وصال کی بو کیسے پا سکتے ہیں،

آخر میں کہتے ہیں کہ حاجی تو حرمِ پاک میں رحمتِ الٰہی سے سرفراز کر دیے جاتے ہیں، مگر خسروِ بت پرست کی ظاہری حالت بھی وہاں پہنچ تو کیسے پہونچے، اُن کے حمدیہ تغزل کا لطف اس کے معانی و مطالب میں نہیں ملتا، بلکہ خود اُن کے اشعار کے پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے، یہ وہ غزل ہے جس سے محفلِ سماع میں وجد طاری ہوتا ہے:

اے ز خیالِ ما بروں در تو خیال کے رسد	با صفتِ تو عقل را لافِ کمال کے رسد
گر ہمہ مردم و ملک خاک شوند بر درت	دامنِ عزتِ ترا گرد و ملال کے رسد
کنگرِ کبریاے تو ہست فراز لامکاں	طائرِ ما در آں ہوا بے پر و بال کے رسد
بر درِ بے نیازیت صد چو حسین کربلا	تشنہ بماند بر گذر تا بہ زلال کے رسد
ہست بہ تخت گاہِ دل جلوۂ قربِ روز و شب	لیک بہ جلوۂ چناں چشمِ خیال کے رسد
در چمنے کہ بلبلش روحِ قدس نمی سزد	گل چیناں خاک را بوے وصال کے رسد
آیتِ رحمت از حرم ہست براے حاجیاں	خسروِ بت پرست را جز خط و خال کے رسد

امیر خسرو اپنی درد بھری آواز میں موسیقی کے پورے فن کے ساتھ اپنے قصیدے اور غزل کے حمدیہ اشعار اپنے مرشد کو سناتے ہوں گے، تو اُن کی مجلس کی پوری فضا انوارِ الٰہی سے معمور ہو جاتی ہو گی، اُن کی حمد اور مناجات کے نغموں میں وہی کیفیت ہے، جو خواجگانِ چشت کے یہاں

توحید کی تعلیمات میں ملتی ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فرماتے ہیں کہ عارف جب وحدانیت اور ربوبیت کا جلال دیکھتا ہے، تو پھر اس کی نظر غیر پر نہیں پڑتی ہے، اور وہ گویا نابینا ہو جاتا ہے، عارف کی محنت یہ ہے کہ حق کے سوا کسی چیز سے لگاؤ نہ رکھے، عارف کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں، ہیبت، تعظیم اور حیا، اپنے گناہوں سے شرمندہ ہونا ہیبت ہے، طاعت گذاری تعظیم ہے، اور خدا کے سوا کسی پر نظر نہ ڈالنا حیا ہے، (دلیل العارفین ص ۴۸-۴۹، سیر الاقطاب ص ۱۳۹)

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی تعلیم یہ تھی کہ ہر حال میں خداوند تعالیٰ کی پناہ کا جویاں ہونا چاہئے، اس کا نام عزیمت ہے، اور اس عزیمت کو عمل میں کر دینا چاہئے، (فوائد الفواد ص ۸۱) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے یہ تعلیم دی کہ درویش اہلِ عشق ہوتے ہیں اور علما اہلِ عقل (افضل الفوائد) اُن میں سے کون ایسی بات ہے، جس کے لئے امیر خسروؒ نے اپنی حمد اور مناجات میں دعا نہیں کی، اور پھر اپنے مرشد کی طرح عشقِ الٰہی کے جویاں بھی رہے، جیسا کہ ان کے حمدیہ اشعار اور مناجات سے ظاہر ہے، مثلاً دول رانی خضر خاں (ص ۷) میں کہتے ہیں، کہ اے خدا اس دل میں عشق کی بنیاد ایسی ڈال دے، کہ یہ مٹی ہمیشہ سبزہ زار بنی رہے، اور اے اللہ عشق کی ایسی شراب پے در پے پلا دے کہ قیامت کے روز عشق کی شراب کے نشہ میں مست رہوں،

چناں بنیادِ عشق افگن درین دل	کہ ردید جاودانی سبزہ زیں گل
چنانم دہ شئے پے در پے عشق	کہ فردا مست خیزم از پئے عشق

اور اُن کی دعا مقبول ہوئی کہ ان کے دل میں جو عشق کا سوز پیدا ہوا وہ ہماری روحانی وراثت کا بہت بڑا سرمایہ ہے، اسی کی بدولت انھوں نے اپنی غزلوں کو

عشقِ الٰہی سے کچھ ایسا گداز اور لالہ زار بنا دیا ہے، کہ آج بھی سماع کی محفلوں میں اُن کے عشقیہ اشعار کے سوز و گداز سے روحانی کیفیات کی ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے، انھوں نے عشقِ الٰہی پر کیسے کیسے اشعار کہہ کر اپنے جذبات کے گل اور بوٹے کھلائے ہیں، اس کا ذکر آگے آئے گا،

چشتیہ سلسلہ کے اولیا عشقِ الٰہی کے بعد عشقِ رسول پر زور دیتے رہے ہیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے ملفوظات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بڑے ہی والہانہ انداز میں کرتے ہیں، حدیث نبویؐ کا ذکر کر کے رونے لگتے، ایک جگہ اپنے ملفوظات میں فرمایا کہ افسوس ہے اس شخص پر جو قیامت کے دن آپؐ سے شرمندہ ہوگا اس کی جگہ کہاں ہوگی، جو آپؐ سے شرمندہ ہوگا، یہ فرما چکے تو ہا ہائے کہہ کے رو پڑے، (دلیل العارفین مجلس دوم) حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ہر رات تین ہزار بار درود شریف پڑھ کر رسول اللہ صلعم کے دربار گوہر بار میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے (سیر الاولیا ص ۵۰) حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی مجلس میں جب ذکر رسول آتا تو زار و قطار رونے لگتے، ایک بار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وصال کا خود ہی ذکر کرنے لگے، تو آہ کھینچی نعرہ لگایا، اور روتے روتے بیہوش ہو گئے (راحت القلوب ص ۶۸) حضرت نظام الدین اولیاؒ کی محبتِ رسول کا یہ عالم تھا کہ وصال سے کچھ دنوں پہلے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ نظام تم سے ملنے کا اشتیاق ہے، اس خواب کے بعد سفر آخرت کے لئے بے چین رہے، کھانا پینا بالکل ترک کر دیا، برابر آنکھوں سے آنسو جاری رہتا، کبھی کچھ کھانے کے لئے اصرار کیا جاتا تو فرماتے کہ حضرت رسالت مآبؐ کے مشتاق کو دنیاوی غذا کی ضرورت نہیں، دوا پینے کے لئے کہا جاتا تو فرماتے ؏

دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

اسی حالت میں وفات پائی، (سیر الاولیا ص ۱۵۵-۱۵۴)

یہی ساری والہانہ عشقیہ کیفیات امیر خسروؒ کی نعتوں میں ملتی ہیں، جن کا اظہار طرح طرح سے کرتے ہیں،

مطلع الانوار کی نعت (ص ۱۰-۱۱) میں کہتے ہیں، کہ چرخ کی ساری آرایش رسول عربؐ ہی کے لئے ہے، احمد کا نام لکھا گیا تو اس میں حمد بھی آگیا ہے، اور کلام پاک کی سورۂ حٰم بھی، آپؐ اُمّی تھے، مگر مکتب ازلی میں ساری عقل سیکھ لی تھی، آپ نے اپنی پریشان حال اُمّت کے سامنے سارا پردہ اٹھایا، اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے جو بخشش ہوگی، اس کے آپ ضامن ہیں، آپؐ کا سینہ نازک تھا، اور دل بھی، مگر اس میں ساری دنیا کا بار اٹھا لیا، خاص و عام کو جو آزادی کا پروانہ ملا، وہ آپ کی رسالت کی توقیع کے ذریعہ سے ملا، آپ ہی کے نور سے آفتاب آسمان پر چلتا ہے، اور صبح بھی نمودار ہوتی ہے،

چرخ کہ زیں ساں عجب آراستند — بہر رسولِ عرب آراستند
احمد مرسلؐ کہ نوشتہ قلم — حمد بنام وے و حٰم ہم
زاں ازلی مکتب او امی لقب — عقل کل آموختہ لوحِ ادب
پردہ کشِ امت شوریدہ کار — ضامنِ آمرزشِ آمرزگار
بار جہاں بر دلِ آں نازنیں — سینہ چناں و بارے چنیں
نامہ کہ آزادی خاص ست و عام — کردہ بہ توقیع رسالت تمام

مطلع الانوار کی نعت سوم میں کہتے ہیں کہ آپ کی بات خدا کے خزانہ کی کنجی ہے، آپ ہی کی وجہ سے الست کی آواز بلند ہوئی، اور نیست ہست میں تبدیل ہو گیا، آپ ہی کا خم ابرو ہلال میں ہے، آپ ہی کے موے مبارک کی شکن شام ہے، آپ کے گیسو کی سیاہی تاریک شب ہے،

اور آپ ہی کی وجہ سے پھولوں کو آبرو حاصل ہوئی،

اے سخت گنج خدا را کلید
گوہر آن گنج تو کردی پدید

از تو صلائے بہ الست آمدہ
نیست بہ ہمانی ہست آمدہ

غرۂ ماہ از خمِ ابروے تست
طرۂ شام از شکنِ موے تست

بردہ ز گیسوے تو شب تار موے
وز خوے تو یافتہ گل آبروی

شیریں خسرو کی نعت میں کہتے ہیں کہ آپ نہ ہوتے تو آسمان پیدا نہ کیا جاتا، اور کعبہ کو بھی رفعت حاصل نہ ہوتی، حضرت عیسیٰ نے اپنے دم سے آپ کی جگہ صاف کی، اور حضرت خضر نے آبِ حیات سے آپ کے قدم دھوئے،

ز مویش چرخ را منشور لولاک
ز زلفش کعبہ را زنجیر افلاک

مسیحا از دمِ خود رفتہ جایش
خضر از آبِ حیواں شستہ پایش

مجنوں لیلیٰ کی نعت میں رقمطراز ہیں کہ آپ رسولوں کے بادشاہ ہیں، شفاعت کرنے والے آپ کا نور پہلے اور بعد میں آفتاب پیدا ہوا، آپ عقل کے چراغ کو نور عطا کرنے والے ہیں آفرینش کے چشم و چراغ ہیں، آسمانی تخت کے شہنشاہ ہیں، جو چیز چھپی ہوئی ہے، اس کے جاننے والے ہیں، رسالت کی مملکت کے سلطان ہیں صحیفۂ جلالت کے طغرا ہیں،

شاہ رسل شفیع مرسل
خورشید یسین و نورِ اوّل

ہم نور دہ چراغِ بنیش
ہم چشم و چراغِ آفرینش

شاہنشہ تخت آسمانی
خوانندۂ تختۂ نہانی

سلطان ممالکِ رسالت
طغراے صحیفۂ جلالت،

آئینہ سکندری کی نعت میں کہتے ہیں کہ آپ رسول قوی ہیں اور آپ حق کے واضح ثبوت ہیں آپ کی حکمت

درست ہے، اور آپ نے جتنا حکم دیا ہے، وہ ہر طرح مضبوط ہے آپ نیلے آسمان کے تخت کے بادشاہ ہیں، آپ ہی کی وجہ سے ہستی کی عمارت تعمیر ہوئی، یہ آسمان جو رخشندہ باغ دکھائی دیتا ہے، آپ ہی کے نور سے روشن ہے، آپ کے چہرۂ مبارک کے باغ سے سارا باغ پھول بنا ہوا ہے، اور اس باغ کے بلبل روح الامین یعنی حضرت جبرئیلؑ ہیں، لوح محفوظ میں آپ ہی کی شان نظر آتی ہے، اور دنیا کی سیاہی اور سپیدی آپ ہی کی وجہ سے ہے،

رسولِ قوی حجتِ آشکار
بہ حکمت درست و بہ حکم استوار

محمدؐ شہِ لاجوردی سریر
کزو گشت ہستی عمارت پذیر

ز باغِ رخش ہست بستاں گلے
دراں باغ روح الامیں بلبلے

ہمہ لوح محفوظ در شانِ او
سیاہ و سپیدِ جہان زآنِ او

مثنوی ہشت بہشت میں کہتے ہیں کہ گنہگاروں کو قیامت کے روز کے آفتاب کے نیچے آپ ہی کے حکم سے لمبا سایہ حاصل ہوگا، آپ اُمّی تھے لیکن تختۂ کن پر آپ ہی نے یہ حرف لکھا، آپ کا قلم اور آپ کی بات ہر طرح درست ہے، آپ کی ذاتِ مبارک لوگوں کی نجات کی کنجی ہے، دنیا کے لئے حیات بھی ہے، اور آب حیات بھی۔ اور آپ کا وصف بیان کرنا عقل سے باہر ہے، آپ کی بارگاہ لامکاں سے برتر ہے، جو مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نور بن رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے سایہ سے دور رکھے،

عاصیاں را در آفتاب نشور
ظل ممدود داد از منشور

امی و حرف سنجِ تختہ کن
قلمش راست کار و راست سخن

ذات او خلق را کلید نجات
ہم حیات جہاں ہم آبِ حیات

وصفش از حد عقل و جاں برتر
بارگاہش از لامکاں برتر

ہر کہ از مصطفٰے نہ دارد نور   سایہ اش دور باد از ما دور

مثنوی نہ سپہر میں اپنی غایت عقیدت میں کہتے ہیں کہ جب حضرت آدمؑ ابھی پیدا بھی نہیں کئے گئے تھے تو آپ ہفت محراب کے قبلہ بنے ہوئے تھے، حضرت ابراہیم خلیل کو آپ ہی کے وجود سے نور ملا، اسی لئے گل نار ان کے لئے گلنار بن گئی، حضرت سلیمانؑ دیو اور پری کے بادشاہ اس لئے بنے کہ آپ ہی سے اُن کو تاج اور انگشتری ملی، حضرت موسیٰؑ نے آپ کے پہلے اللہ تعالیٰ کی روشنی دیکھنی چاہی تھی تو اُن کو پہاڑ دکھلایا گیا، کہ یہی اُن کے لئے کافی ہے، حضرت ادریسؑ آپ سے پہلے بہشت میں داخل ہوئے تو آپ کیلئے طوبیٰ کی نگہبانی کے لئے مقرر ہوئے حضرت اسماعیلؑ آپ ہی کی وجہ سے پاک ہوئے، اسی لئے اُن کی گردن پر خنجر چلایا گیا، تو اُن کا خون خاک پر نہیں گرا، حضرت نوحؑ نے طوفان میں کشتی چلائی، تو آپ ہی کی وجہ سے اپنی قوم کو بچا سکے، آپ کو آفتاب اور ماہتاب نے اس طرح سجدہ کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اس طرح کا سجدہ خواب میں نہیں دیکھا، آپ کی جاں بخش فصاحت سے دم عیسیٰؑ بھی حیرت میں رہ گیا، آپ کے معجزے بیان کئے جائیں تو آسمان میں لرزہ پیدا ہو جائے،

ہنوز آدمؑ اندر گل و آب بود   کہ او قبلۂ ہفت محراب بود
خلیلؑ از وجودش پر انوار گشت   کہ بر وے گل نار گلنار گشت
سلیماںؑ کہ شد شاہ دیو و پری   از و یافتہ تاج و انگشتری
تقاضیش از و کرد موسیٰؑ ہوس   نمودند سنگش کہ ایں پیش و بس
چو ادریسؑ در خلد شد پیش از و   نگہداشت طوبیٰ بر خویش از و
سماعیل زو مایہ داشت پاک   ازاں دشنہ نہ فگند خویش خاک
بہ ملاحیش نوحؑ چوں در نشست   زبے آبی قوم خود باز رست

چناں سجدہ کردش مہ و آفتاب   کہ یوسفؑ ندید آں کرامت بخواب
چو جاں بخش گشتہ بہ نطقِ فصیح   بماندہ ز حیرت دم اندر مسیح
چو از معجزاتش برانم سخن
فتد لرزہ در آسمانِ کہن

امیر خسرو نے اپنی نعتوں میں جو خیالات ظاہر کئے ہیں، ممکن ہے کہ اُن سے بعض محتاط علمائے ظاہر اور محدثین اتفاق نہ کریں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت و محبت میں ایسے خیالات بعض مفسروں کے یہاں بھی ملیں گے، صوفیائے کرام کے یہاں تو ایسے تخیلات عام طور سے پائے جاتے ہیں، خود حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مجموعۂ ملفوظات راحت المحبین میں ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ آفتاب و ماہتاب کو جو نور دیا گیا ہے، وہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں رائی کے دانہ کے برابر بھی نہیں ہے، کون و مکان میں جس قدر اشیا ہیں، ان سب پر نام پاک حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ثبت ہے اور ان سب کو حکم ہے کہ زندگی بھر آپ کا نام مبارک لیتے رہیں، آسمان و زمین میں ایک بھی جگہ ایسی نہیں کہ جس جگہ آپ کا نام مبارک نہ لکھا ہو، آپ کا معجزہ تھا کہ آپ بیداری اور خواب میں یکساں دیکھتے اور سنتے تھے، آپ کی شان اس قدر بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی کہ آپ کو پیدا نہ کرتا تو آسمان اور زمین کو بھی پیدا نہ کرتا، فردائے قیامت میں حق تعالیٰ وہی کرے گا جو آپ کہیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا حبیب فرمایا ہے، اور محبت کا یہی اقتضاء ہے، جس روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مردہ زندہ کیا، ان کو حکم ہوا کہ نام مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مردہ پر دم کریں، پس حق تعالیٰ نے برکت سے نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مردہ کو زندہ کیا، حضرت داؤد علیٰ نبینا و علیہ السلام

ایک روز حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ فرشتے آسمان پر کس امر میں مشغول رہتے ہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ اے داؤد جس روز سے وہ پیدا ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا ہے کہ تم آٹھ پہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نامحدود بھیجتے رہو، ورنہ تمہارا نام جریدۂ ملائکہ سے خارج کر دیا جائے گا، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول کرنی منظور کی تو حکم دیا کہ اے داود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو میری درگاہ میں شفیع لاؤ کہ تمہاری توبہ قبول ہو، ان سب وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان و ما فیہما سب بطفیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہوئے ہیں، اور آپ ان سب سے برتر ہیں"

(راحت المحبین اردو ترجمہ ص ۴ - ۳۰۲)

امیر خسرو نے یہی ساری باتیں اپنے نعتیہ اشعار میں شاعرانہ انداز میں کہی ہیں، اوپر کے ملفوظات کو سامنے رکھ کر امیر خسرو کے کچھ اور اشعار کا مطالعہ ناظرین کریں،

مجنوں لیلیٰ میں ہے:-

سلطانِ ممالکِ رسالت　　طغرائے صحیفۂ جلالت
مجموعہ کشائے پردۂ غیب　　گنجور خزینہ ہائے لاریب
پروانہ رسانِ ظلمت و نور　　وز نور دخان نوشتہ منشور
گنجینۂ کیمیائے عالم　　پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نامش بہ سریر بادشاہی　　توقیع سپیدی و سیاہی
جاروب زنان بارگاہش　　از پر فرشتہ رُفتہ راہش
لشکرکش آسمان غلامش　　تعویذ کلاہ کردنامش
بستہ کمر آسمان بکارش　　انجم ہمہ چاؤشان بارش

شیرین خسرو میں ہے،

محمد کاصل ہستی شد وجودش　　جہاں گردے ز شادروان جودش
چراغ روشن از نور خدائی　　جہاں را داده از ظلمت رہائی
کتاب انبیا رکآمد ز بیشی،　　ہمہ بر نامۂ پاکش حواشی
ملائک خوانده شمع آسمانش　　دخان نور روشن از دہانش

ہشت بہشت میں ہے،

درۃ التاج کن فکاں نسبش　　قرۃ العین انس و جاں لقبش
ہستی از وے علم بر آورده　　او تفاخر بہ نیستی کرده،
عیسی از کیمیاے جانت پوست　　بیگماں کیمیاے عیسی اوست

مثنوی نہ سپہر میں ہے،

سرو سرور جمع پیغمبراں　　شمعی ز انوار او اختراں
رسولے ز پیغمبراں جملہ فرد　　کہ ایزد رسالت برو ختم کرد
عمل راں در وازۂ کبریا　　علم دار قلب صفِ انبیا

امیر خسرو نے جہاں اپنی نعتوں میں اپنے مرشد کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی ہے، وہاں اساتذۂ فن کی تقلید میں بھی نعتیں کہی ہیں، مثال کے طور پر ہم یہاں پران کے اور نظامی گنجوی کے کچھ متوازی نعتیہ اشعار پیش کرتے ہیں،

نظامی: اے ختم پیمبرانِ مرسل　　حلوائے پسین و ملح اول
خسرو: شاہ رسل و شفیع مرسل　　خورشید پسین و نور اول
نظامی: اے حاکم نسور کفایت　　فرمان دہ جملہ ولایت

خسرو:	سلطانِ ممالکِ رسالت	طغرائے صحیفۂ جلالت
نظامی:	اے خاکِ تو توتیائے بینش	روشن بہ تو چشمِ آفرینش
خسرو:	ہم نور دو چراغِ بینش	ہم چشم و چراغِ آفرینش
نظامی:	خاکِ تو ادیم روئے آدم	نور تو چراغ ہر دو عالم
خسرو:	گنجینۂ کیمیائے عالم	پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نظامی:	ستوں شد خرد مند از پشت او	مہ انگشت کش گشت زانگشت او
خسرو:	حمایت نشیں چرخ در مشت او	مہ از داغدارانِ انگشت او
	در چرخ را ماہ قفل زدست	کلید موی انگشت پیمبر است

ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے مجنوں لیلیٰ اور مولانا محمد سعید فاروقی نے آئینۂ سکندری کے مقدمہ میں امیر خسرو کے اشعار کو زیادہ بہتر، دلگداز، پرشکوہ اور لطیف قرار دیا ہے، لیکن مقابلہ اور موازنہ سے قطع نظر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ نظامی گنجوی نے جس جذبۂ پاک سے اپنی نعتیں کہی ہیں، اسی والہانہ جذبہ سے خسرو نے بھی اپنے نعتیہ اشعار کہے، اور جس طرح نظامی نے ہر نعت کے بعد معراج کا ذکر کیا ہے اسی طرح خسرو نے معراج محمدی لکھ کر اپنی عقیدت اور محبت کے نذرانے پیش کئے ہیں جن کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد ہی کی طرح عشق رسول میں فنافی الرسول تھے، اس کا اندازہ ان نعتیہ اشعار سے بھی ہوگا جو گذشتہ اوراق میں ناظرین کی نظروں سے گذرے ہیں عشق الٰہی اور عشق رسول ہی کا دوسرا نام تصوف ہے امیر خسرو کو یہ دونوں چیزیں قدرت کی طرف سے عطا ہوئیں، ان کی جلا ان کے مرشد کی صحبت میں بھی ہوتی رہی، پھر اسی کو اپنی قادر الکلامی سے اپنی شاعری میں منتقل کرتے رہے، (باقی)

حکیم سنائی غزنوی پر بین الاقوامی سمینار

منعقدہ کابل (افغانستان)

از: ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اکتوبر ۱۹۷۷ء میں حکیم سنائی غزنوی کا نہصد سالہ جشن منایا گیا، اس جشن کا سب سے قابلِ ذکر پہلو اس موقع کا ہفت روزہ سمینار تھا، جو ۱۷ اکتوبر تا ۲۳ اکتوبر رہا، راقم حروف نے بھی اس میں ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی تھی، خیال تھا کہ اس سمینار کی مفصل روداد شائع ہوگی، اس لئے اس پر الگ سے لکھنا ایک لحاظ سے بے سود تھا۔ لیکن چونکہ وہاں کی بساط ہی الٹ گئی، اب سمینار کی روداد کی توقع عبث ہے، اسی خیال سے میں نے ضروری سمجھا کہ چند واقعات جو میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان کو یکجا کر دوں، شاید کسی کے کچھ کام آجائے۔

اپریل ۱۹۷۷ء میں سنائی کے سمینار میں شرکت کا دعوت نامہ افغانستان کی وزارتِ اطلاعات و کلتور[1] کی طرف سے آیا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی، اس لئے کہ میں نے افغانستان کا سفر نہیں کیا تھا، حکیم سنائی پر کام کرنے کی وجہ سے غزنین اور بلخ کے نام اتنے کثرت سے سنے تھے کہ ان کے دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، دعوت نامے کے جواب میں میں نے فوراً اپنی رضامندی کا خط بھیجا۔ ٹکٹ آنے میں کچھ دیر ہوئی تو میں نے ایک خط وزارت متعلقہ کے نام کابل بھیجا، مگر وہاں سے جلد جواب نہ آنے پر متردد تھا۔ اس درمیان انڈین کاؤنسل

[1] یعنی کلچر

فار کلچرل ریلیشن (ICCR) کا خط آیا کہ حکومت ہند آپ کو سنائی کے سیمنار کے سلسلے میں کابل بھیجنا چاہتی ہے، میں نے انھیں بھی اپنی رضامندی بھیج دی۔ اور مضمون کے عنوان سے مطلع کر دیا، چند ہی روز میں مضمون کا مطالبہ آیا، میرے پاس سنائی کے کچھ غیر مطبوعہ کلام پر ایک مفصل یادداشت موجود تھی، میں نے اسی پر چند روز میں ایک مضمون انگریزی میں لکھکر (ICCR) کے واسطے سے سفارت ہند کابل بھیج دیا، وہاں سے جواب آیا کہ مضمون فارسی میں ہوتا تو زیادہ بہتر تھا، لیکن اب اتنا وقت نہ تھا کہ میں اسے فارسی میں منتقل کرتا، میں نے خیال کیا کہ کابل ہی میں یہ کام ہوجائے گا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہاں یہ کام ہوگیا۔

ICCR سے خط و کتابت کے درمیان حکومت کابل کی طرف سے ٹکٹ کی اطلاع آگئی، میں نے ICCR کو اس سے مطلع کیا تو وہاں کے متعلقین بہت خوش ہوئے، اور مجھے لکھا کہ میں حکومت کابل کے ٹکٹ سے استفادہ کروں البتہ[1] ان لوگوں نے کلیرنس وغیرہ کی زحمت سے مجھے بچا دیا۔

اسی درمیان کابل سے منتظمین سیمنار نے یہ اطلاع دی کہ دانشگاہ کابل میری کتاب "مکاتیب سنائی"[2] چھاپ رہی ہے، انھوں نے مزید یہ خواہش ظاہر کی کہ امید ہے مجھے اس باب میں کوئی اعتراض نہ ہوگا، میں نے کتاب کے دوبارہ چھاپنے کی فوراً اجازت دے دی اور ضمناً بعض دوسری مطلوبہ معلومات بھی فراہم کر دیں،

---

[1] اس سلسلے کی زحمت کا اندازہ وہ لوگ بخوبی لگا سکتے ہیں جن کو ہندوستان سے باہر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس زحمت کے مقابلے میں بیرون ملک سفر کا لطف حساس طبائع کے لیے بہت کم ہوتا ہے۔ [2] یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی،

۱۶ اکتوبر کو افغان ایر سے کابل گیا، افغان ایر سے جانے پر اصرار کی وجہ یہ تھی کہ اسی تاریخ میں میری بیٹی ڈاکٹر ماریہ بلقیس مع اپنی دو بچیوں کے انگلستان جا رہی تھی، بہرحال یہ خواہش پوری ہوئی، کابل ایرپورٹ پر ماریہ سے ملنے ڈاکٹر قریشی[1] اور ان کی بیوی بچے آئے ہوئے تھے، اور مجھے لینے سفارت ہند کے ایک افسر مع ڈاکٹر تھڈانی کے تشریف لائے تھے، ان حضرات کی وجہ سے بڑی سہولت رہی اور تھوڑے ہی وقفے میں ایرپورٹ کی کارروائی ختم ہوگئی، لیکن جہاز کے چھوٹنے تک ہم لوگ رکے رہے، اسلئے کہ میری بیٹی اور اس کے بچے اسی جہاز سے انگلستان جا رہے تھے، کوئی آدھا گھنٹہ ہم لوگ وہاں رکے رہے، پھر بیٹی کو رخصت کرکے شہر کی طرف چلے، تھوڑی دیر میں مجھے کابل کے سب سے بڑے ہوٹل یعنی کابل ہوٹل میں پہنچا دیا گیا۔ ہوٹل کے کاونٹر پر مجھے ایک سردار جی نظر آئے، ان سے پوچھا تو وہ افغانی سردار ٹھہرے، بہرحال وہ اردو بولتے تھے، دوسرے روز ہوٹل کے ایک اسسٹنٹ منیجر مسٹر کتوازی سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا وہ اس لحاظ سے میرے شاگرد ہیں، کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی، اور دری (فارسی کو تمام افغانی بغیر استثنا اسی نام سے یاد کرتے ہیں)، ان کے پاس ایک مضمون کی حیثیت سے تھی،

بعد مغرب ایک غیر رسمی ملاقاتی جلسہ تھا، اس میں معزز اساتذہ، ارکان وزارتِ کلتور، منتظمین سیمنار وغیرہ تشریف لائے، اتفاق کی بات یہ تھی کہ باہر سے آنے والوں میں ابھی صرف دو ہی ایک حضرات تشریف لا سکے تھے، جلسے میں پروفیسر عبدالحی حبیبی سے ملاقات ہوئی، وہ بڑے تپاک سے ملے، انھوں نے سب حضرات سے تعارف کرایا، ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد مجھ سے پوچھا کہ آجکل کیا کام ہو رہا ہے، میں نے دیوان عمید لوئکی[2] کی

---

[1] سفارت ہند میں فارسی کے ترجمان ہیں، [2] عمید لوئکی سلطان ناصرالدین محمود پسر سلطان شمس الدین التمش کے دور کا شاعر ہے، اس کا کلام کمیاب اور مجموعہ دیوان نایاب تھا، جستہ جستہ نظمیں ملتی ہیں۔

ترتیب کا ذکر کیا، عمید لویکی کے دیوان کی بابت بڑی دلچسپی ظاہر کی، تو مجھے کچھ استعجاب سا ہوا، میں نے پوچھا کہ عمید لویکی سے آپ کی شناسائی کس قدر ہے، انھوں نے وہی باتیں دہرائیں، جو بدایونی کی منتخب التواریخ اور دوسری کتابوں میں درج ہیں، ان کو اس بات کی توثیق کی سخت ضرورت تھی کہ عمید کی نسبت کی صحیح قرأت کیا ہے، دراصل عمید، لویکی، لوکی، لونکی، تونکی، تونکی، تولکی، دیلمی وغیرہ متعدد نسبتوں سے منتخب کتابوں میں مذکور ہے، لیکن سوائے لویکی کے ساری نسبتیں غلط ہیں، اس لئے کہ اولاً دیوان میں ہر جگہ نہایت واضح طور پر یہی صورت درج ہے، دوم حسب ذیل شعر سے نہ صرف اس کی صحیح قرأت بلکہ صحیح نوعیت کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔

نسب از عمید یرم حسب از تبار لویک ۔۔۔ بکدام سلک دیدی دو گہر چنیں منظم

گویا لویکی نسبت کسی مقام کی طرف نہیں، بلکہ کسی خاندان کی طرف ہے، میری اس توضیح پر حبیبی صاحب اور دوسرے حضرات کو بڑی خوشی ہوئی، استاد حبیبی صاحب نے پوچھا کہ آپ کو "لویک" کا حال معلوم ہے، میرے اس اظہار پر کہ میں نے لویک کا پتہ چلانے کے لیے سنام[1] کے لوگوں سے رابطہ قائم کیا تھا، مگر سب بے سود رہا، کہنے لگے کہ لویک کابل اور غزنین کا حکمران خاندان تھا، اسی خاندان کے آخری فرماں روا کو سلطان ناصر الدین سبکتگین نے شکست دیکر غزنوی حکومت کی بنیاد ڈالی، انھوں نے مزید یہ فرمایا کہ اس خاندان کا ذکر بغلان کے ایک کتبہ میں بشکل Loix (لویخ) آیا ہے، چنانچہ اس سلسلے کی ساری معلومات انھوں نے ایک کتابچہ بعنوان "لویکان غزنہ" اور تعلیقات طبقات ناصری میں جمع کر دی ہیں، دوسرے دن اس کتابچہ کا ایک نسخہ مجھے عنایت کیا، غرض

[1] پٹیالہ کے قریب پنجاب کا ایک شہر عمید کا تعلق اسی شہر سے تھا۔

میرا مسئلہ اس طرح حل ہوا، اور ان کو اس لحاظ سے خوشی ہوئی کہ لویک خاندان کے باقیات صالحات ہندوستان میں موجود تھے،

۱۰ اکتوبر کو ریڈیو کابل کے ہال میں سیمینار کا افتتاح ہوا، صدر مملکت جنرل داؤد خاں افتتاح کے فرائض انجام دینے والے تھے، مگر کسی وجہ سے وہ نہیں آسکے، تو ان کے بجائے وزیر اطلاعات و کلتور دکتور نوین نے افتتاح سیمینار کی رسم ادا کی، بیرونی مندوبین کی نمائندگی راقم کے سپرد ہوئی، چنانچہ ہندوستان و افغانستان کے ثقافتی تعلقات پر ایک مختصر گفتگو راقم نے کی، اسی دن شام سے مقالہ خوانی کی مجلسیں شروع ہوئیں، مجلسوں کی صدارت بیرونی مندوبین نے کی، مقالہ پر کافی گرما گرم بحثیں ہوئیں، مقالات عام طور پر فارسی میں پڑھے جاتے، دو تین مقالے پشتو میں اور اتنے ہی انگریزی میں تھے، میرا مقالہ بھی انگریزی میں تھا، لیکن میں نے اس کو فارسی میں منتقل کر کے دوسرے روز پیش کیا تھا، غیر ملکی شرکاء میں میرے علاوہ حسب ذیل حضرات تھے،

پروفیسر نوری عثمانوف (روس)	پروفیسر رابرٹ معین الدین طامس (امریکا)
ڈاکٹر بوادتاس (سویڈن)	پروفیسر کرسٹوف بورگل (انگلستان)
پروفیسر مس شمیل (جرمنی)	پروفیسر اسکارچیا (اٹلی)
ڈاکٹر زکی عبد الحسین الصراف (بغداد، عراق)	زلمی ہیواد مل (انگلستان ؟)
پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (پاکستان)	ڈاکٹر عبد القادر قرہ خان (استنبول، ترکی)
ڈاکٹر مظاہر مصفا (تہران)	ڈاکٹر غلام حسین یوسفی (مشہد، ایران)

ان کے علاوہ ایرانی سفارت کے کلچرل کاؤنسلر، اور کابل یونیورسٹی سے وابستہ دو ہندوستانی استاد یعنی سید محمد رضوان حسین اور ڈاکٹر ڈی، سی، سری واستو بھی مندوبین میں

شامل تھے، غیر ملکی شرکا میں نوری عثمانوف سے میری کافی شناسائی اور باہمی خط وکتابت تھی، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، شاہنامہ کی تصحیح میں ان کی مشارکت ہے، روس کے فارسی دانشمندوں میں ان کا پایہ علمی کافی بلند ہے، فی الحال ماسکو انسٹی ٹیوٹ ملل آسیائی سے وابستہ ہیں، انھوں نے سنائی کی لفظیات پر ایک مقالہ سمینار میں پیش کیا تھا مگر اس کی نقل میرے پاس نہیں، ڈاکٹر بو داتاس سویڈن کے انسٹیٹوٹ آف ایشین اسٹڈیز سے متعلق ہیں، وہ حکیم سنائی کے اس لحاظ سے متخصص ہیں کہ انھوں نے سنائی کی طرف منسوب مثنوی، طریق التحقیق کا عمیق مطالعہ کیا ہے، اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سنائی کی طرف اس کا انتساب غلط ہے، بظاہر یہ مثنوی ایک شاعر احمد بن حسن بن محمد نخجوانی کی معلوم ہوتی ہے، اس مثنوی کا ایک مثالی متن شایع کیا ہے، اور اس پر ایک تنقیدی مقدمہ لکھا ہے جو ۲۴۵ صفحوں پر مشتمل ہے، اور جس میں مثنوی کے اشعار کا ترجمہ بھی شامل ہے، ڈاکٹر بو داتاس نے سنائی کی وفات پر ایک مقالہ بھی سمینار میں پیش کیا تھا، ان کے نزدیک سنائی کی وفات کی تاریخ ۵۲۹ ہجری جو کلیات کے سب سے قدیم نسخے کے مقدمے میں ہے، قرین قیاس ہے۔ رابرٹ معین الدین ٹامسن ادبیات فارسی کے آدمی نہیں، انگریزی ادب کے استاد اور انگریزی کے شاعر ہیں، حضرت معین الدین چشتیؒ سے متاثر ہو کر اجمیر میں مسلمان ہو گئے ہیں، اور اپنا نام عقیدۃً انھیں کے نام پر رکھا ہے، تصوف سے کافی لگاؤ ہے۔ ہندوستان اور افغانستان آتے جاتے رہتے ہیں، علاوہ ایک مضمون کے اپنے اقامتِ افغانستان کے احساسات کو انگریزی اشعار میں پیش کیا تھا، پاکستانی مندوب صوفی غلام مصطفی تبسم کے نام سے میں واقف تھا، لیکن ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی، نہایت شریف اور باوضع انسان تھے، کم آمیز اور خاموش تھے، مگر گفتگو کرتے تو گویا پھول جھڑتے تھے، شیروانی اور پاجامے میں ملبوس تھے، سمینار میں مضمون پیش کرنے کے علاوہ فارسی میں

ایک نظم پیش کی جو کافی پسند کی گئی، سنا ہے، وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، ڈاکٹر مظاہر مصفا سنائی کے بڑے قدردانوں میں ہیں، چنانچہ انھوں نے بڑی عرق ریزی سے ان کا دیوان مرتب کیا جو کافی متداول ہے، انھوں نے کوئی مقالہ تو نہیں پیش کیا لیکن فارسی شاعری کے ارتقا میں سنائی کے حصے پر ایک پُر مغز، جامع اور مدلل تقریر کی، افسوس یہ کہ یہ تقریر آخری جلسے میں ہوئی، معلوم نہیں ضبط کی گئی یا نہیں، کاش وہ شائع ہو جاتی، پروفیسر غلام حسین یوسفی دانشگاہ مشہد کے محترم استاد اور فارسی کی دنیا میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، وہ مقالہ تو پیش نہ کر سکے البتہ جلسہ کی مناسبت سے ایک دلچسپ نظم پیش کی جو کافی پسند کی گئی، پروفیسر مس شمیل کسی تعارف کی محتاج نہیں، تصوف ان کا خاص موضوع ہے، انھوں نے سنائی، رومی اور اقبال کے تعلق سے ایک مضمون پیش کیا، یہ مضمون اسی موقع پر مجلہ ادب دانشگاہ کابل میں چھپا تھا، ڈاکٹر عبد القادر قرہ خان استنبول یونیورسٹی میں استاد اور کافی خوش گفتار شخصیت کے مالک ہیں، وہ دیندار ہیں، چنانچہ جمعہ کو ہمارا پروگرام غزنیں کا تھا، وہاں نماز جمعہ انھوں نے بڑے اہتمام سے ادا کی اور ادا کرائی، دو ہندوستانی استاد جو سمینار میں مدعو تھے، ایک سید رضوان حسین ہیں، یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد اور سنائی کے سمینار کے موقع پر کابل یونیورسٹی میں visiting پروفیسر تھے، قیام کابل کے دوران میرے بڑے کرم فرما رہے، انھوں نے سنائی کی غزلوں میں عشق کے عنوان سے ایک مقالہ انگریزی میں پیش کیا تھا دوسرے ہندوستانی پروفیسر ڈاکٹر سری واستو تھے، وہ الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ہیں، سمینار کے وقت وہ کابل یونیورسٹی میں (visiting) پروفیسر تھے، ان کا مقالہ انگریزی میں

حکیم سنائی کی تاریخی اہمیت پر تھا، ان کی بیوی میری ہم وطن تھیں، اس نسبت سے انھوں نے اور بھی خصوصیت برتی، کابل کے ایک ہفتہ کے قیام میں ہندوستانی سفارت کے کارمند ڈاکٹر قریشی صاحب نے بھی کافی محنت کی، دوسرے کارمند ڈاکٹر تھڈانی تھے جنھوں نے میری واپسی پر ریزرویشن وغیرہ کرایا تھا، ہندوستان کے سفیر محترم سے بھی ملاقات کی، انھوں نے افغانستان کی سیاحت کا انتظام کرنے کا وعدہ کیا لیکن راقم ان کی کرم فرمائیوں سے استفادہ نہ کر سکا۔

افغانی دانشمندوں میں استاد عبدالحی حبیبی استاد مائل ہروی، استاد عبدالشکور رشاد، پروفیسر میر حسین شاہ سے دیرینہ شناسائی تھی، استاد حبیبی ایک جلیل القدر علمی شخصیت کے مالک اور فارسی ادب و تاریخ کے بڑے رمز شناس ہیں، انھوں نے متعدد کتابیں ایڈٹ کر کے شائع کی ہیں، ان میں طبقات ناصری، طبقات صوفیہ ہروی، فضائل بلخ، زین الاخبار گردیزی راقم کے پاس موجود ہیں، ان کے علاوہ وہ کئی رسالوں اور کتابوں کے مولف ہیں، جن میں تاریخ افغانستان در عصر گورگانی ہند، پشتو و لویکان غزنہ، زبان دو ہزار سال قبل افغانستان، نگاہی بہ سلامان و ابسال جامی، افغانستان بعد از اسلام، تاریخ مختصر افغانستان یک تحقیق نوین دربارہ کابل شاہان، ہفت کتیبۂ قدیم تاریخ خط و نوشتہ ہای کہن افغانستان، ترجمہ چہار مقالہ بر فردوسی، ظہیر الدین محمد بابر شاہ، ہنر در عہد مغول ہندوستان وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان سے ایران، سمرقند، ہندوستان میں کئی بار ملاقات ہو چکی ہے، اردو زبان میں گفتگو کرتے ہیں، استاد مائل ہروی بڑے نقاد اور محقق ہیں، خاموش اور پر تاثیر شخصیت کے مالک ہیں، ان سے ایران اور ہندوستان میں دو چار بار ملاقات ہو چکی ہے، وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں،

معرفی روزنامہ ہا، جراید و مجلات افغانستان، امواج ہریوا (مجموعۂ اشعار)، شرح حال و زندگی امام فخر رازی، فہرست کتب مطبوعہ افغانستان، امیر حسینی ہروی، آئینۂ تجلی میرزایان برنا باد (تذکرۂ شاعران) تاریخ مختصر ملوک کرت، راہنمائے تاریخ افغانستان وغیرہ۔

استاد عبدالشکور رشاد سے ایران اور ہندوستان میں ملاقات ہو چکی ہے، وہ پشتو کے استاد ہیں، ہندوستان میں رہے ہیں، اور اردو خوب بولتے ہیں، کم گو ہیں لیکن بڑی باوقار شخصیت کے مالک ہیں۔

پروفیسر میر حسین شاہ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں، انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے اسلامک کلچر میں کیا تھا، ڈاکٹر وحید مرزا مرحوم کے عزیز شاگردوں میں ہیں، لکھنؤ کے علاوہ متعدد کانفرنسوں میں ان سے ملاقات ہوئی، علی گڑھ بھی تشریف لائے ہیں، سنائی کے سمینار کے موقع پر کابل یونیورسٹی میں پروفیسر اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین تھے، بڑے نجیب اور باوقار ہیں، مکاتیب سنائی طبع کابل میں مقدمہ انھیں کے قلم کا ہے۔

ان دوستوں کے علاوہ تازہ ملاقاتیوں میں ڈاکٹر روان فرہادی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، یہی سمینار کے روح رواں تھے، ان سے پہلی ملاقات سمینار شروع ہونے سے پہلے والی شام میں ہوئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کے ملاقاتی ہیں، فرمایا کہ صرف آپ کو ہماری حکومت نے کرایہ دے کر بلایا ہے، اور اس خاص اکرام کی تہ میں ایک جذبۂ تشکر ہے، کہ آپ نے مکاتیب سنائی کو بغیر حق التالیف کے دوبارہ چھاپنے کی اجازت دی ہے،" موصوف نے مکاتیب سنائی کے دوسرے ایڈیشن یعنی طبع کابل پر مقدمہ لکھا ہے، روان فرہادی بڑی صلاحیت کے مالک ہیں، ان سے علمی دنیا کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں،

ڈاکٹر امیر محمد اثیر غزنوی بیدل کے بڑے مداحوں میں ہیں، انھوں نے سنائی کے والدین
کے مزار کی تحقیق کی ہے، اور اسی پر ایک مقالہ سمینار میں پیش کیا ہے، اگرچہ وہ طبیب ہیں
لیکن ادبیاتِ فارسی کا بڑا گہرا ذوق ہے، انھوں نے بیدل عظیم آبادی کی طور معرفت کی شرح
لکھی ہے، اس کی جلد اوّل جو خاصی ضخیم ہے پیش نظر ہے، شرح کا عام انداز شارحینِ
قدیم جیسا ہے اس میں ہزاروں اشعار اپنے حافظے سے شامل کئے ہیں، بڑے سادہ، اور
شریف انسان ہیں، غزنین کے رہنے والے ہیں، لہذا اس شہر کے بارے میں ان کی
معلومات بہت زیادہ وسیع ہیں، ان کے بیٹے ادبیات کے طالب علم ہیں، مجھ سے کافی
محبت سے ملے اور مثنویاتِ سنائی کا ایک قدیم مجموعہ جو غزنین میں چھپا تھا، عنایت کیا
حکیم سنائی کی تسخیر کا کیا ذکر کروں کہ میں نے ان کے مکاتیب کے جمع کرنے میں جو حقیر سی
کوشش کی تھی، وہ اس قدر مشکور ہوئی کہ افغانستان کے دانشمندوں کے علاوہ
طلبہ بھی اسی کتاب کی برکت سے میرے نام سے روشناس تھے، اکثر افغانی دانشمندوں نے
"مکاتیب سنائی" کی فرمائش کی، شاید اسی ضرورت سے دانشگاہ کابل نے دوبارہ
طبع کرایا۔

کابل یونیورسٹی کے اساتذہ میں استاد علی اصغر بشیر سنائی کے متخصص ہیں، انھیں کے
زیر اہتمام کلیات اشعار حکیم سنائی مبنی بر نسخۂ کابل چھپا ہے، اگرچہ یہ عکسی چھاپ ہے
لیکن اس پر ایک مفصل مقدمہ ہے، جو مرتب کے ناقدانہ صلاحیت کا مظہر ہے، استاد
بشیر باصلاحیت محقق اور نقاد ہیں،

نوجوان استادوں میں آقائے سرور ہمایوں بڑے باصلاحیت، ذہین اور طباع
ہیں، ان کی تازہ تالیف مقامات تاریخی غزنہ ان کی علمی و تحقیقی صلاحیت کی مظہر ہے

سنائی کے سمینار کے موقع پر کافی کتابیں چھپی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ کلیات اشعار حکیم سنائی چاپ عکسی با مقدمہ و فہارس بکوشش علی اصغر بشیر
کلیات کے جس نسخے کا یہ عکس ہے وہ سنائی کے کلام کے اسوقت تک کے تمام مکشوف
نسخوں میں سب سے قدیم ہے، مرتب کے بقول چھٹی صدی ہجری کے وسط میں اسکی
کتابت ہوئی ہوگی، اسکی اشاعت سے بعض اہم امور پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً اس کی
رو سے سنائی کی وفات ۵۲۹ ہجری ہے، اس سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیقۂ سنائی کا مقدمہ
جو اب تک محمد بن علی الرفا کا سمجھا جاتا رہا ہے، خود حکیم کے قلم کا ہے، محمد بن علی الرفا نے جزوی
تبدیلی سے اسے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے، بشیر صاحب کے محققانہ مقدمے سے بعض
اہم امور سامنے آتے ہیں۔

۲۔ فہرست کتب چاپی دری، یہ ایک عمومی فہرست فارسی کی ۲۰۰۰ کتابوں کی
ہے، جو تقریباً سو سال اخیر میں افغانستان میں چھپی ہیں، یہ فہرست مصنف یا مترجم کے
نام کا لحاظ کرتے ہوئے حروف تہجی سے مرتب ہوئی ہے، مرتب حسین نایل ہیں،

۳۔ سیر العباد الی المعاد، سنائی کی اس مشہور مثنوی کا یہ نسخہ مائل ہروی کا مرتبہ
ہے، اس میں متن کی تحقیق کے ساتھ ایک جامع مقدمہ ہے، جس میں سنائی کے افکار
کا مقابلہ دوسرے مفکرین سے ہوا ہے، ایک اور مقدمہ ہے، ڈاکٹر بہار الدین مجروح
کے قلم کا ہے، آخر میں سیر العباد کی شرح بھی شامل ہے، سیر العباد کا یہ نسخہ اب تک
کے سب چھاپوں سے ہر لحاظ سے بہتر ہے۔

۴۔ احوال و آثار حکیم سنائی غزنوی، آقائے خلیل اللہ خلیلی حکیم سنائی کے بڑے قدردان
و شناسا ہیں، انھیں کی کوشش سے کلیات کا نسخہ مکشوف ہوا، یہ رسالہ ۴۱ سال قبل

لکھا گیا، اب سنائی کی مجلس تجلیل کے موقع پر دوبارہ اضافہ کے بعد علی اصغر بشیر کی توجہ سے شائع ہوا۔

۵۔ غزنہ در دو قرن اخیر۔ تالیف عزیز الدین وکیلی خطاط ہفت قلم کی تصنیف ہے افغانستان میں انیسویں اور بیسویں صدی میں جو تاریخی واقعات رونما ہوئے، اُن کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔

۶۔ وضع اجتماعی دورۂ غزنویاں، ڈکٹر محمد اکبر ہدی کی یہ قابل قدر اور محققانہ تالیف ایک مقدمہ اور حسب ذیل چھ۶ فصلوں پر مشتمل ہے،

"بررسی وضع اجتماعی، منابع درآمد، تشریفات وخاصان درگاہ، تجلیل جشنہا واعیاد، دین ومذہب، فرہنگ دیدیدہ ہای تمدن،

غزنویوں پر ان موضوعات پر کوئی کتاب نظر سے نہیں گذری ہے۔

۷۔ گزیدہ اشعار سنائی، یہ سنائی کے اشعار کا ایک اچھا انتخاب ہے، مرتب محمد حسین نہضت ہیں، قصاید وغزلیات ومقطعات وغیرہ کا کافی حصہ ہے، حدیقہ، سیر العباد، کارنامۂ بلخ اور تحریمۃ القلم کے علاوہ سنائی کی طرف منسوب مثنویوں کا بھی انتخاب شامل کیا گیا ہے۔

۸۔ مقامات تاریخی غزنہ، یہ نہایت اہم تحقیقی کتاب ہے، جس کے مولف افغانستان کے نوجوان اور پُرجوش دانشمند سرور ہمایوں ہیں، غزنہ یا غزنی یا غزنین نام کا دوسرا تلفظ ہے، یہ شہر تاریخی یادگاروں سے بھرا پڑا ہے، ان یادگاروں کے پرکھنے اور جانچنے کا کام آخری درجہ تک نہیں پہنچا ہے، آقائے سرور ہمایوں کی کوشش قابلِ ستائش ہے،

۹۔ مکاتیب سنائی، مکاتیب کا دوسرا ایڈیشن اس بات کا اعتراف ہے کہ سنائی کے نثری کلام پر اب تک کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوسکا ہے، جو مقالے اس سمینار میں پڑھے گئے

اُن میں سے کسی میں سنائی کے نثری کلام کی بابت کوئی گفتگو شامل نہ تھی، اس سے مزید واضح ہے کہ مکاتیب کی اشاعت (۱۹۶۲) سے اب تک اس سلسلے میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی، کابل سے واپسی پر راقم نے مکاتیب پر نظر ثانی کا کام شروع کر دیا، خوشی کی بات ہے کہ سنائی کے دو مکتوب (جو مطبوعہ نسخے میں زیر شمارہ ۵، ۴ شامل ہیں) ایک ایسے خطی مجموعہ سے ملے جس کی کتابت ۵۴۳ ہجری میں ہوئی تھی، یہ مجموعہ دو عارفانہ تصانیف۔ بستان العارفین اور منتخب رونق المجالس پر مشتمل ہے، اس کے کاتب کا نام یحیٰی بن عمر بن خطیب الجرمخورانی ہے، مجموعہ کے خاتمے پر سنائی کے دونوں خطوط ... شامل ہیں، ترقیمہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"منتخب فی اخیر ربیع الاول من سنہ ثلث واربعین وخمسمایہ کتبہ
یحیی بن عمر بن خطیب الجرمخورانی وحسبنا اللہ ونعم الوکیل"۔

یہ ترقیمہ سنائی کے خطوط کے خاتمے پر آیا ہے، اس سے اس مجموعہ مع خطوط کی تاریخ کتابت ربیع الاول ۵۴۳ ہجری متحقق ہے۔

(باقی)

شعر العجم حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتداء، اس کی عہد بعہد کی ترقیوں، اور اُن کی خصوصیات، وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ ہر دور کے ممتاز شعراء مثلاً رودکی، فردوسی، حکیم سنائی، عمر خیام، انوری، نظامی گنجوی کا تذکرہ اور اُن کے کلام پر تنقید ہے، مؤلفہ مولانا شبلی نعمانی، قیمت:- ۱۵/-

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

ہمدرد اسلامیکس

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

یہ سہ ماہی انگریزی رسالہ ہمدرد نیشنل فونڈیشن کراچی سے شایع ہوتا ہے، اس کے مدیر جناب حکیم محمد سعید ہیں، جو اپنی علم نوازی اور علم پروری کی خوش مذاقی کی وجہ سے نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی شہرت حاصل کر رہے ہیں، وہ اس برصغیر کے ان مایہ ناز لوگوں میں ہیں، جو اپنی غیر معمولی صلاحیت اور ذہانت سے طرح طرح کے کارنامے انجام دے رہے ہیں، انھوں نے پاکستان میں یونانی طب کو جس طرح از سر نو زندہ کیا ہے اس سے ان کی کلاہ پر امتیاز کی کلغی برابر لگی رہے گی، وہ علمی کاموں میں بھی برابر دلچسپی لیتے رہتے ہیں، پاکستان کی بڑی سے بڑی علمی سرگرمیوں میں ان کا نمایاں حصہ رہتا ہے،

ان کی علم نوازی کی ایک روشن مثال "ہمدرد اسلامیکس" کا اجرا بھی ہے، جو عمدہ طباعت اور کاغذ کے ساتھ ان کی ادارت میں نکل رہا ہے، اس کے دو شمارے جلد اول نمبر ۲ اور دوسرا جلد دوم نمبر ا میرے سامنے ہیں، ان میں علمی، تاریخی، سیاسی اور مذہبی مضامین کے تنوع کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، مضمون نگار نہ صرف پاکستان

کے ہیں بلکہ امریکہ، کینڈا، انگلستان، جرمنی، اور ایران کے بھی ہیں، جس سے اس رسالہ میں بین الاقوامی رنگ پیدا ہو گیا ہے، جناب حکیم محمد سعید کی خوبی یہ ہے کہ جس کام کو شروع کرتے ہیں، اس میں نفاست، عمدگی، اور خوش سلیقگی کا اعلیٰ معیار پیدا کر دیتے ہیں، امید کہ یہ رسالہ جس شان سے نکلا ہے، اسی طرح برابر نکل کر علم و فن کی دولت میں اضافہ کرتا رہے گا۔

اس رسالہ کے ایک شمارہ میں جناب حمود الرحمٰن (سابق چیف جسٹس، سپریم کورٹ پاکستان) کا ایک اہم مضمون "ریاست کا اسلامی تخیل" کے عنوان سے ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد کی حکمرانی کے اصول کا تجزیہ بڑی بالغ نظری سے کیا گیا ہے، ایک حکومت اور ریاست کا جو اعلیٰ نمونہ ہو سکتا ہے، اس کی تشکیل اس عہد میں ضرور کی گئی، مگر اس کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں ان کا جواز فاضل مضمون نگار کے مقالہ میں نہیں، کیا اس لیے کہ ان کو علماء اور فقہاء صحیح اسلامی طرز حکومت قرار نہیں دیتے ہیں،

ایک عامی مسلمان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں؟ کیا وہ اسلامی حکومتیں نہ تھیں، اگر وہ اسلامی حکومتیں نہ تھیں تو کیا مسلمانوں کی بھی حکومتیں نہ تھیں؟ کیا ان میں اسلامی قوانین، وغیرہ رائج نہیں رہے؟ اور اگر ان میں اسلامی قوانین کی بالادستی رہی تو پھر ان کو اسلامی حکومتیں کیوں نہ کہی جائیں؟

پھر ایک ادنیٰ مسلمان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین کا جو انتخاب ہوا تو کیا یہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت یا تعلیم کے مطابق تھا؟ اگر تھا تو چاروں خلفاء کے انتخاب کا طرز علحدہ علحدہ کیوں رہا؟ اس سے تو

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کے سربراہ کے انتخاب کے سلسلہ میں کوئی واضح ہدایت نہیں دی، اسی کے ساتھ کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ آپ کے یہاں حکمرانی کی ساری بنیادی باتیں تو ملتی ہیں، مگر حکومت کے طرز اور تشکیل کی کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی، آپ نے ہر شعبۂ زندگی کی جزوی باتوں کی واضح تعلیم دی ہے، مگر طرز حکومت اور اسکی تشکیل کو بالکل غیر واضح چھوڑ دیا ہے، اسی لئے گذشتہ چودہ سو سال سے اس کی کوئی ایسی متعین شکل مرتب نہیں ہو سکی ہے، جو ہر اسلامی ملک میں یکسان طور پر مروج ہو، اسکی وجہ کیا یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ حکومت جغرافیائی حالات اور زمانہ کے تحت بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے ایک ملک یا ایک زمانہ کا طرز حکومت دوسرے ملک اور دوسرے زمانہ کے لیے ضروری نہیں کہ مفید اور موزوں ہو، اسلام ایک عالمگیر اور دائمی مذہب ہے، جو ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے ہے، اس لئے طرز حکومت اور اس کی تشکیل کا غیر واضح رہنا ہی مناسب ہے، کہ جب جیسی ضرورت ہو، اسی کے مطابق حکومت بنائی جائے، البتہ حکومت کے لیے کچھ بنیادی باتیں ایسی ہیں، جو ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر ماحول کیلئے لازمی ہیں، ان کی وضاحت ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی ہے، جو ایسی اعلیٰ سیاسی تعلیمات ہیں، جن پر فخر کیا جا سکتا ہے، آپ کی تعلیم یہ ہے کہ حکومت کا سربراہ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ حاکمیت پر ایمان رکھتا ہو، کتاب و سنت کے احکام کا پابند ہو، شوریٰ پر عامل ہو، اسلامی مساوات و اخوت کا قائل ہو، اپنی حکومت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی دی ہوئی امانت سمجھتا ہو، اور وہ اس سے بازپرس کریں تو وہ جوابدہ ہو، متقی ہو، عوام و خواص کا اس پر اعتماد ہو، عادل ہو، بیت المال کا مصرف جائز طریقہ پر لیتا ہو، مسرف نہ ہو، خراج وصول کرنے میں ظلم و تعدی نہ کرتا ہو،

جنگ کرتا ہو تو اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کی خاطر کرتا ہو، جنگ میں بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ زیادتی نہ کرتا ہو، ان کو خواہ مخواہ قتل نہ کرتا ہو، آبادی کی کھیتی بلکہ درختوں کو بلا ضرورت برباد نہ کرتا ہو۔ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت ضرور دیتا ہو، اگر وہ قبول نہ کریں تو ان پر کوئی زبردستی نہ کرتا ہو، جزیہ لے کر ان کی عزت، مال اور عبادت گاہوں کی پوری حفاظت کرتا ہو وغیرہ وغیرہ، یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جن سے انحراف کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، مگر حکومت کا طرز کیسا ہو؟ اس کی تشکیل کیسی ہو؟ اس کی پوری وضاحت نہیں، اگر جمہوری ہو تو کس قسم کی جمہوریت ہو؟ جمہوریت انتخابی ہو تو انتخاب کی قسم کیا ہو؟ انتخاب میں رائے دہندہ کون سے لوگ ہوں؟ لوگوں کے ووٹ کی اہمیت زیادہ دی جائے یا لوگوں کی عام مرضی کا خیال رکھا جائے؟ چاروں خلفاے راشدین کے انتخاب کی جو علٰحدہ علٰحدہ نوعیت رہی، اس سے ان سوالات کے واضح جوابات نہیں ملتے، یہ انتخاب نامزدگی کے ذریعہ سے بھی ہوا، چھ آدمیوں کی مجلس کے ذریعہ سے بھی عمل میں آیا، اور مختلف فیہ بھی بن گیا، البتہ یہ ایک بات ضرور واضح ہے کہ صحابۂ کرام کی اکثریت کی ہم نوائی انتخاب کا فیصلہ کن جز بنی، یعنی جو سربراہ ہو وہ رائے عامہ کے لئے قابلِ قبول ہو،

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں حکومت میں خاندانی وراثت تسلیم نہیں کی گئی، مگر سربراہ حکومت کے جمہوری طرز انتخاب کی نوعیت تیس برس کے اندر بدلتی گئی تو پھر کیا یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ زمانہ کی رفتار اور حالات کی تبدیلی سے حکومت کی نوعیت کا بھی بدلنا ناگزیر ہے، جس کی مثال خود ہماری تاریخ میں ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد نہ صرف بنو امیہ اور بنو عباس بلکہ جہاں مسلمان

پہونچے وہاں کی حکومتیں خاندانی وراثت کے ساتھ چلیں، ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی رہی کہ یہ اسلام کی سیاسی اسپرٹ کے خلاف ہیں، مگر وہ موثر ثابت نہیں ہوئی، حتیٰ کہ علماء اور فقہاء نے بھی ان کو مجبوراً گوارا کر لیا، اگر علماء اور جمہور مسلمان اپنی ناراضگی کے باوجود ان سے تعاون کرتے رہے، اور انھوں نے ان کے دور حکومت میں اپنے کو خوش، خوشحال اور مطمئن پایا تو ان کے تعاون اور ان کی خوشی سے یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے غیر شعوری طور پر ان سے بیعت کر لیا ؟ یا اگر انکی حکومتیں خاندانی رہیں، لیکن اسلام کے قوانین کی بالادستی کو اپنی حکومت میں شعوری یا غیر شعوری طور پر برقرار رکھا تو کیا ان کی خاندانی حکومتوں کو خارج از اسلام محض اس لئے سمجھا جائے گا کہ وہ خلافت راشدہ کے طرز پر نہ تھیں ؟ خاندانی حکومتوں کے سربراہ اپنی نجی زندگی میں خلفائے راشدین کا تتبع نہ کر سکے، لیکن وہ اپنی حکمرانی میں اسلامی شعار، اسلامی حمیت اور اسلامی غیرت کی نگہبانی اور پشتیبانی حتی الامکان کرتے رہے، جس سے اسلام کی شان اور آن بان میں اضافہ ہوتا رہا، تو بھی ان کی تاریخ کو اسلام کے دائرہ سے خارج ہی کر دینا پڑے گا ؟

میری ذاتی خواہش تو یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد جتنی حکومتیں جہاں بھی قائم ہوئیں، وہ ان ہی کے نمونے کی ہوتیں، ان کے سربراہ اپنی نجی اور پبلک زندگی میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ہی کی اعلیٰ مثالیں پیش کرتے رہتے، ان کے فوجی سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح اور حضرت خالدؓ بن ولید ہی بنے رہتے، انکے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت سعید بن عامرؓ ہی بن کر اپنے فرائض ادا کرتے رہتے۔

ہماری اپنی خواہش جیسی بھی ہو، یا ہمارے مذہبی اور سیاسی جذبات چاہے اعلیٰ کتنے ہی ہوں، مگر تاریخ کے فیصلے کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے، خلفائے راشدین کی حکومت اعلیٰ اور ارفع اس لئے رہی کہ اس دور کے لوگ بھی اعلیٰ اور ارفع تھے، اس لئے اعلیٰ اور ارفع حکومت چل پڑی، مگر اس کے بعد زمانہ اور حالات کے بدلنے سے ویسے لوگ نہیں رہے، تو حکومت کے طرز اور اس کی تشکیل کی نوعیت بھی بدل گئی، خاندانی حکومتیں قائم ہوگئیں، جو گو اسلامی اسپرٹ کے خلاف تھیں، مگر تاریخ کا یہی فیصلہ ہوا جس کے بعد کیا یہ کہنا نہ پڑیگا کہ سیاست میں زمانہ کی ضرورت اور وقت کے تقاضے کو سامنے رکھنا ضروری ہے، ایک راسخ مسلمان کی حیثیت سے جناب حمود الرحمٰن صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام میں بادشاہت اور ڈکٹیٹر شپ کی کوئی جگہ نہیں ہے، (جلد دوم، نمبر ا صفحہ ۵۵) دارالمصنفین بھی اسی مکتبِ فکر کا قائل ہے، مگر ایک عامی مسلمان یہ سوچتا ہے کہ نظری حیثیت سے اسلام میں بادشاہت کی جگہ نہ رہی ہو، مگر عملی حیثیت سے تو اسلام کی تاریخ میں بادشاہت کی جگہ نمایاں رہی، اگر خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کی جیسی خاندانی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، وہ سب غیر اسلامی قرار دی جائیں تو پھر اسلام کی سیاسی تاریخ ہمارے پاس کیا رہ جاتی ہے؟ ان کو اسلام کے سیاسی جسم کا بدگوشت سمجھ کر کاٹا نہیں جاسکتا، نہ صرف عام مسلمان بلکہ علماء اور صلحا بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کے کارناموں پر فخر کرتے رہے ہیں دنیا کے مسلمان یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ دور کے اسلامی ممالک میں کہیں خاندانی حکومتیں ہیں، کہیں جمہوریت ہے، اور کہیں فوجی ڈکٹیٹر شپ ہے، یہ سب اصطلاحاً اسلامی حکومتیں ہی سمجھی جاتی ہیں، ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں سے اپنی حکومت

شروع کی یعنی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آج خاندانی حکومت ہی قائم ہے، جلالۃ الملک
امیر فیصل مرحوم اسلام کی شمع کے پروانہ سمجھے جاتے تھے، ان کے خلاف یہ کہہ کر جنگ
کرنے کی کوشش کی جاتی کہ وہ خاندانی حکومت کے ایک سربراہ بن کر اسلام کی
سیاسی اسپرٹ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، تو کیا اس جنگ کی کوئی حمایت کرتا؟
خود پاکستان میں اس وقت فوجی ڈکٹیٹرشپ قائم ہے، وہاں کے علماء اور سیاسی
مدبرین نیا انتخاب کرانے کے تو مصر ہیں، مگر جنرل ضیاء الحق کو غیر اسلامی طرز حکومت
کا سربراہ قرار نہیں دیتے، بلکہ جنرل صاحب اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے جسطرح
خواہاں اور کوشاں ہیں، اس بنا پر ان کے پرستاران کو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ دینے
کے لیے تیار ہیں، جو اسلام کی تاریخ کے عظیم المرتبت حکمرانوں کو دیا گیا ہے، پھر پاکستان
میں اب تک برطانوی طرز کی پارلیمانی حکومت قائم ہوتی رہی، یا آئندہ جو ہوگی،
یا عورتوں کو انتخابی مہم میں ووٹ دینے، یا ان کو دستور ساز مجلسوں کی رکنیت بلکہ
ان کی صدارت کے لئے انتخاب لڑنے کا جو حق دیا گیا، یا ملک کے دستور بننے کے بعد
کتاب وسنت سے زیادہ اس کی جو اہمیت دی گئی، یا سربراہ حکومت کے خلاف
عدم اعتماد کی تجویزیں پیش کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے، یا مجلس شوریٰ یعنی قانون ساز
مجلسوں کو بالائی اور زیریں حصوں میں تقسیم کرکے جو تفریق پیدا کی گئی ہے، یا صوبوں میں
خود مختاری کی جو مہم چلائی جاتی ہے، یا عدلیہ میں غیر اسلامی قوانین کے ذریعہ سے مقدموں کے
جو فیصلے ہوتے رہے یا صدر وزیر اعظم اور بیرونی ممالک کے سربراہوں کے استقبال
میں جس تزک واحتشام سے قیصر وکسریٰ کی روایت کے مطابق دعوتیں ہوتی رہتی
ہیں، الخ کیا ان سب کی مثالیں خلافت راشدہ کے عہد میں ملتی ہیں؟ مگر پاکستان

کیا دوسرے اسلامی ممالک میں بھی یہ چیزیں گوارا کی جا رہی ہیں، اور آئندہ بھی کی جائیں گی؟
اور یہ کہا جاتا ہے کہ وقت کا تقاضا یہی ہے، پھر نہ صرف سعودی عرب بلکہ یمن، اردن،
اور مراکش میں اب بھی بادشاہیت ہے، اس کو کیوں انگیز کیا جا رہا ہے، کیا اسی لئے تو
وہاں کے ماحول اور حالات کے تقاضے کی بنا پر یہ ناگزیر ہیں، یورپ کی مثال بھی سامنے
ہے، وہاں ہر قسم کے نظری اور فکری سیاسی تجربے کے بعد کوئی ایسا سیاسی نظام وضع
نہ ہو سکا جو وہاں کے ہر ملک کے لئے یکساں ہو، کہیں بادشاہت ہے، تو کہیں پارلیمانی
جمہوریت ہے، کہیں صدارتی نظام ہے، کہیں آمرانہ حکومت رہی، تو کہیں کمیونزم ہے،
ایک زمانہ میں بادشاہ کو خدا کا سایہ ظل الٰہی اور بھگوان کا اوتار سمجھا جاتا رہا، مگر اب ایک
بادشاہ ملک سے دربدر ہونے اور دوسرے ملکوں میں جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا
جاتا ہے، اس جمہوری دور میں جمہوریت کو بڑی رحمت سمجھا جاتا ہے، مگر یہ بھی ناکام
رہتی ہے تو فوجی ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جاتی ہے، جو کچھ دنوں کے لیے تو ضرور جمہوریت سے
زیادہ باعث رحمت سمجھی جاتی ہے۔

اس تحریر کے لکھنے کا مقصد عام مسلمانوں کی ذہنی الجھنوں اور خلشوں کی ترجمانی
کرنی ہے کہ وہ کس طرز حکومت کو اچھا اور کس کو رد کر دیں، وہ صدیوں تک بادشاہت
کی دل آویزیوں اور رعنائیوں سے متاثر کیے گئے، اب وہ جمہوریت کے نغمے سے مسحور
کیے جا رہے ہیں، وہ خود چاہتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے طرز کی حکومت ہر اسلامی
ملک میں قائم ہو مگر کہیں قائم نہ ہوئی اور نہ قائم ہونے کی امید ہے، پھر ایسے مسلمانوں کا
ذہن مستقل طور پر سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔

ہمارے سیاسی مفکرین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مورخانہ، ناقدانہ اور

مفکرانہ انداز میں غور کریں کہ اسلامی تاریخ میں تیس برس کے بعد ہم کسی جگہ خلافت راشدہ کے طرز کی حکومت آخر کیوں قائم نہیں ہو سکی، اس کے عوامل کیا تھے؟ خاندانی حکومتیں کیوں چل پڑیں؟ ان سے اسلام کو کیا نقصان پہنچا؟ ان سے کیا اسلام کی سطوت میں اضافہ ہوا؟ ان کا زوال بھی ہوتا رہا، جس سے اسلام کے ناموس پر بھی اثر پڑا، ان کے زوال کے وجوہ کی بھی چھان بین کی ضرورت ہے، اور اب جب کہ جمہوریت کا دور ہے، یہ غور کرنا ہے کہ خلافت راشدہ کے طرز کی جمہوریت قائم ہو سکتی ہے کہ نہیں یا یہ اتنی اعلیٰ اور ارفع ہے کہ اس طرز کی حکومت کا بروئے کار آنا موجودہ دور میں ممکن نہیں، اگر ممکن نہیں تو پھر کون سی جمہوریت اسلامی کہلا سکتی ہے، جن اسلامی ملکوں میں بادشاہت ہے وہاں یہ ختم کی جا سکتی ہے کہ نہیں، یا ایران اور افغانستان کے انقلاب کی طرح چھوڑ دی جائیں کہ وہ خود ہی انقلاب کی نذر ہو جائیں گی، لیکن ایسے انقلابات کے بعد کمیونزم بھی آ جاتا ہے، بعض ایسے ملک بھی ہیں جو کہلاتے تو اسلامی ہیں، مگر وہاں کے ارباب حکومت سوشلزم اور کمیونزم کی طرف مائل ہیں، کیوں؟ کیا اس لئے کہ اسلام کا سیاسی اور اقتصادی نظام ان کی مشکلوں کا حل نہیں کر سکتا ہے؟ دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت کی اب بھی دلی خواہش ہے کہ اسلامی ممالک میں اسلامی قوانین، اسلامی روایات، اسلامی غیرت اور اسلامی حمیت کی بالادستی اور حاکمیت ہو، خواہ طرز حکومت کیسا ہی ہو، اسی لیے اسلامی اسپرٹ کے خلاف جب کبھی کہیں حکومت کی باگ ڈور فوج کا کوئی عہدیدار سنبھال لیتا ہے، اور وہ ڈکٹیٹر بن کر اسلام کی عزت و ناموس کا نقیب بن جاتا ہے، تو وہ اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، مگر

جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کا یہ نقیب اسلام کی بالادستی اور حاکمیت سے ماڈرنزم، سوشلزم، کمیونزم اور طرح طرح کے ازم کے زیر اثرات کا تریاق پیش نہیں کر رہا ہے، اور ان کی اقتصادی مشکلوں، سیاسی الجھنوں، اور روزمرہ کی عملی زندگی کی پیچیدگیوں کو دور نہیں کر رہا ہے تو وہ بددل ہو کر اپنے ہی سے یہ سوال کرنے لگتے ہیں کہ کیا اسلام زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا؟ کیا یہ ہماری سیاسی، اقتصادی اور عملی زندگی کی پیچیدگیوں اور دشواریوں کو دور نہیں کر سکتا، کیا اسلام کا اعلیٰ سیاسی تخیل صرف کتابوں ہی میں لکھنے کی چیز رہ گئی ہے؟

ان سوالات کے تشفی بخش جوابات ہی میں سیاست کے اسلامی تخیل کی عملی کامیابی کا راز مضمر ہے، یہ جوابات اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ کے اوراق میں بھی مل جائیں گے، اس مدت میں ہر جگہ خاندانی حکومتیں ہی ضرور قائم ہوئیں انکے بعض حکمرانوں کی سیاہ کاریوں اور خامیوں پر اگر ہم آنسو بہا سکتے ہیں، تو ان کے بعض فرمانرواؤں کی اولوالعزمیوں اور بیدار مغزیوں سے درس اور بصیرت بھی حاصل کر سکتے ہیں، ان میں سے بعض بادشاہوں کی بدعنوانیوں اور مطلق العنانیوں پر ہم ضرور لعنت بھیج سکتے ہیں، مگر ان میں سے کچھ ایسے بھی گزرے ہیں، جن کی اسلامی حمیت اور اسلامی غیرت کی مثالوں سے موجودہ دور کی اسلامی سیاست میں تابناکی، اور درخشانی پیدا کی جا سکتی ہے، ان سب حکومتوں کے عروج و زوال کے اسباب و علل کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اسلامی سیاست کی پولیٹیکل سائنس مرتب کی جا سکتی ہے، اور اب سے پہلے کی جا چکی ہے، مگر ضرورت اس کی ہے کہ ان کو جدید رنگ میں پیش کر کے جدید ذہن کو مطمئن کیا جائے۔

کیا ہم رسالہ "ہمدرد اسلامیکس" سے اس کی توقع کریں کہ اس قسم کے مباحث پر زیادہ سے زیادہ مضامین شائع کرکے مسلمانوں کے الجھے ہوئے ذہن کو صاف کرنے کی کوشش کریگا، اس کے صفحات ان مباحث کے لئے زیادہ موزوں ہیں، کیونکہ اسکے مضمون نگاروں کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ ان مباحث کو بین الاقوامی رنگ بھی دے سکتا ہے۔

اس رسالہ کے ایک لائق مضمون نگار جناب اے۔ ایس۔ بزمی انصاری صاحب نے ایک کتاب کے ریویو کے سلسلہ میں مسلم سوسائٹی کے بعض موجودہ، معاشرتی مسائل" کے عنوان سے شاہد بہت دکھ سے سیکولرزم، ماڈرنزم، بینک کے منافع، روایت پرستی، عفو، زکوٰۃ، مخلوط تعلیم اور آزادی نسواں پر بڑی اچھی بحث کی ہے، پھر ایک اور مضمون نگار رفیع الشہاب صاحب نے مسلمانوں میں طریق شادی اور جہیز کے سلسلہ میں کچھ سوالات اٹھائے ہیں، مگر چودہ سو سال کے بعد ابھی تک ان مسائل کو سلجھانے میں مسلمان الجھے ہوئے ہیں تو پھر کیسے امید کی جائے کہ اسلامی ممالک کے لوگ ایسے سیاسی نظام کی تشکیل کرسکیں گے جو خلافت راشدہ کے نمونہ کا ہو۔

مگر زندہ قوم اپنی مایوسیوں پر قابو پالیتی ہے، اور فاتح اور کامران بن کر بھی ابھرتی ہے، اگر اسلامیکس ایسے مسائل پر جاندار اور باوقار مضامین شائع کرا کے اسلامی ممالک کے مسلمانوں کے ذہن کو بیدار کردے تو یہ اس کی بڑی خدمت ہوگی۔

"ص۔ ع"

....٥....

مطبوعاتِ جدیدہ

امریکہ میں دو مہینے: مرتبہ مولانا محمد رابع حسنی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۳۰۴، مجلد مع گردپوش، قیمت:- ۱۵ روپے، پتہ:- مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو دعوت وتبلیغ کے کام سے فطری مناسبت اور دلچسپی ہے اس غرض سے وہ ہندوستان کے مختلف گوشوں کے علاوہ اکثر اسلامی ملکوں اور یورپ کا سفر کرچکے ہیں، دو برس قبل شمالی امریکہ کے مسلم طلبہ کی انجمن ایم۔ ایس۔ اے۔ کی دعوت پر اس کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لئے وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ و کناڈا تشریف لے گئے تھے، وہاں انھوں نے امریکہ کے بڑے بڑے شہروں، اہم صنعتی و تہذیبی اداروں، قدرتی مناظر اور بعض دیہاتوں کے علاوہ کالجوں یونیورسٹیوں، علمی، تعلیمی، مذہبی و ثقافتی اداروں اور انجمنوں کی بھی سیر کی، مختلف مذاہب و ملل کے افراد، علمی، تعلیمی، اور مذہبی اشخاص سے ملاقات کی اور تبادلۂ خیال کیا، موجودہ امریکی زندگی کے خط وخال اور اس کی تعمیر و ترقی اور تہذیب و معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا، اور تعلیمی، علمی، دینی، اخلاقی، تمدنی، اور سیاسی حالات کا قریب سے جائزہ لیا، زیرِ نظر کتاب اُن کے مشاہدات و تاثرات اور سفرِ امریکہ کی روداد ہے جس کو اُن کے رفیقِ سفر اور بھانجے مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے اُن کے ایما سے قلمبند کیا ہے، وہ سفر کے دوران اعداد و شمار اور روزمرہ کے واقعات کی یادداشتیں لکھتے جاتے تھے، بعد میں ان تحریروں اور امریکہ سے متعلق

دوسری کتابوں کی مدد سے یہ دلچسپ اور پُر از معلومات سفرنامہ مرتب کیا، جس کو خود مولینا
نے بھی اشاعت سے قبل پڑھوا کر سُنا اور اس میں ضروری و مناسب ترمیم و اضافہ کیا، اس طرح
اس کتاب میں ان دونوں صاحبوں کے احساسات و تاثرات شامل ہیں، علاوہ ازیں اس میں
مولانا کی علمی و دعوتی گفتگو، اہم مسائل کے بارہ میں ان کا اظہارِ خیال، اور ان کی امریکی تقریروں کا
خلاصہ بھی دیا گیا ہے، جو کتاب کی صورت میں اب علٰحدہ بھی چھپ گئی ہیں، مولانا کو عرصہ سے
نزول الماء کی شکایت تھی، اس سفر میں انھوں نے آنکھ کا آپریشن کرایا، اس کی سرگذشت،
اسپتال کی خصوصیات اور دوسری قابلِ ذکر باتیں بھی ذکر کر دی گئی ہیں، یہ سفر دعوتی تھا
اس لئے اس میں امریکہ میں دین کی اشاعت کے امکانات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اور وہاں کے
مسلمانوں کے حالات و معاملات، اور اُن کی بعض تحریکوں اور مذہبی فرقوں کے عقائد و
رسوم کے بارہ میں مفید معلومات بھی درج کی گئی ہیں، اس کے علاوہ میزبانوں، ملاقاتیوں اور
استفادہ کرنے والوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اہم مقامات اور عمارتوں کی تصویریں بھی شامل ہیں،
اس کتاب سے موجودہ امریکہ کا تعارف ہو جاتا ہے، اور وہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں
کی تصویر سامنے آجاتی ہے، مصنف نے جہاں سائنس، ٹکنالوجی، علوم و فنون اور معیشت
و تمدن میں امریکہ کی برتری و ترقی کا ذکر کر کے دکھایا ہے، کہ ع

افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

وہیں اس کے اخلاقی زوال، دینی پستی جرائم میں اضافہ، مادہ پرستی، خدا بیزاری، خود
غرضی، مفاد پرستی، قومی عصبیت، اور نسلی برتری وغیرہ کی تفصیل بیان کر کے بتایا ہے،

ع:- جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا

اس اعتبار سے یہ کتاب امریکہ کی خوبی و خامی دونوں کا مرقع ہے، اور اس کے مطالعہ سے

ان لوگوں کو بھی امریکہ کے بارے میں بہت کچھ واقفیت ہو سکتی ہے، جن کو اس کے سفر کا اتفاق
نہیں ہوا ہے،

سیرت طیبہ از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت
قدرے بہتر، صفحات ۴۴۴، مجلد قیمت ۱۰ روپیہ، پتہ:- مکتبہ علمیہ قاضی واڑہ میرٹھ،

اس کے پہلے اڈیشن پر معارف میں عرصہ ہوا تبصرہ ہو چکا ہے، یہ دوسرا اڈیشن ہے، اس میں آنحضرت ؐ
کی پیدائش سے وفات تک کے اہم واقعات ہیں، شروع میں بعثت نبوی سے پہلے کے عرب و عجم کے
حالات پر ایک نظر بھی ڈالی گئی ہے، تاکہ شبِ ظلمت کے بعد صبح صادق کا صحیح اندازہ ہو سکے، کتاب کے
مصنف محتاجِ تعارف نہیں ہیں، جدید و قدیم دونوں حلقے ان سے بخوبی واقف ہیں، کتاب میں
صحیح و مستند واقعات دلنشین پیرایے میں لکھے گئے ہیں، امید ہے کہ یہ اڈیشن بھی پہلے کی طرح مقبول ہوگا،

شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خلاف پروپگنڈا } مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ روپیہ، پتہ:- مکتبہ الفرقان لکھنؤ،

شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی سے علماء کے ایک طبقہ کو بدگمانی ہے، اسے دور کرنے کے لئے
عرصہ ہوا مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی مفصل کتاب شائع ہوئی تھی، زیرِ نظر کتاب میں بھی اس کا ذکر ہے کہ رد شرک و
بدعت کے حامیوں، بے دین عناصر، اور استعمار پسند انگریزوں نے شیخ کے خلاف بڑا پروپگنڈا کیا
تھا، اس سے علمائے دیوبند میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا حسین احمد مدنی بھی متاثر ہو گئے
تھے، اگرچہ بعد میں اُن کا نقطۂ نظر بدل گیا تھا، مولانا محمد منظور نعمانی نے اس کتاب میں ان حضرات کا
یہ موقف بھی تحریر کیا ہے اور شیخ کی صفائی بھی دی ہے، اگر اس کے ساتھ مشاہیر دیوبند کی اس قسم کی
تحریریں بھی شیخ کے بارہ میں درج کر دی جاتیں تو کتاب کی افادیت اور بڑھ جاتی، "ض"

جلد ۱۲۴ ماہ شوال المکرم سنہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۷۹ء عدد ۳

مضامین